لفظ آئینہ

سجّاد مرزا

Marfat.com

لفظ آئینہ

مضامین

سجاد مرزا

فروغ ادب اکادمی
88-بی سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ
فون: 0431-251603

Marfat.com

111282

خوبصورت، معیاری اور

دیدہ زیب کتابوں کا اہم مرکز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : لفظ آئینہ

مصنف : سجاد مرزا

سال اشاعت: 2002

تعداد : 500

قیمت : [redacted]

کمپوزنگ : نجمی کمپوزنگ سنٹر

ناشر : فروغ ادب اکادمی

88-بی سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ

فون: 0431-251603

Marfat.com

انتساب

آئینہ دلوں کے نام

Marfat.com

نام ـــــــــــــــــــ عبدالحمید بیگ

قلمی نام ـــــــــــــــــــ سجاد مرزا

تاریخ پیدائش ـــــــــــــــــــ ۸ فروری ۱۹۴۴ء

جائے پیدائش ـــــــــــــــــــ ہوشیارپور

لیکچرار شعبۂ اُردو۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ

سجّاد مرزا کی مطبوعہ کتب

1۔ لہو پکارے گا	1966ء
2۔ سوچاں	1983ء
3۔ اکھراں ہتھ زنجیراں	1984ء
4۔ بقائے دوام	1986ء
5۔ کیفِ دوام	1988ء
6۔ دشتِ تنہائی	1990ء
7۔ چراغِ آرزو	1992ء
8۔ درد کی خوشبو	1994ء
9۔ غالبِ نکتہ بیں	1994ء
10۔ پرتوِ اقبال	1997ء
11۔ شوقِ نیاز	1998ء
12۔ لفظ آئینہ	2002ء

Marfat.com

آئینہ خانہ

۱۔لفظ آئینہ (محمد اقبال نجمی)	۷
۲۔سلیم اختر فارانی	۱۵
۳۔آزاد غزل	۲۵
۴۔خلیفہ امام الدین بقا جالندھری	۴۱
۵۔غالب کا ایک شعر	۴۸
۶۔روایت شناس شاعر	۵۳
۷۔رنگ، خوشبو، روشنی کا شاعر	۵۶
۸۔نئے موسموں کا شاعر	۶۳
۹۔نرمان	۷۳
۱۰۔مشکِ منور	۷۸
۱۱۔قطرہ ایک لہو کا	۸۶
۱۲۔مرکزِ یقین	۸۸
۱۳۔وقت لاوقت	۹۲
۱۴۔گنج ہائے گراں مایہ	۹۷
۱۵۔جادۂ شوق و محبت	۱۱۰
۱۶۔شام و سحر کے اداریے	۱۱۳
۱۷۔پرتوِ غالب	۱۱۶

Marfat.com

۱۸۔شکیب جلالی،افسانے سے حقیقت تک	۱۲۱
۱۹۔زادِ ہجر	۱۳۲
۲۰۔حضرت خواجہ کریم اللہ عباسی کی غزل نگاری	۱۳۶
۲۱۔انا پرست شاعر(راسخ عرفانی)	۱۴۴
۲۲۔اقبال ساجد اور اس کا اثاثہ	۱۵۶
۲۳۔میرے بزرگ میرے ہمسفر	۱۶۹
۲۴۔اداس لمحوں کا شاعر	۱۷۴
۲۵۔عہد ساز شاعر(ماجد الباقری)	۱۸۱
۲۶۔پرکھ پڑچول	۱۹۴
۲۷۔آبِ زرِ تمنا کا شاعر	۱۹۸

Marfat.com

لفظ آئینہ

محمد اقبال نجمی

لفظ آئینہ سجاد مرزا کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ سجاد مرزا گذشتہ چالیس سال سے اردو اور پنجابی ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اُن کی اب تک جو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں ان میں ۱۔لہو پکارے گا ۱۹۶۶ء (طویل نظم) ۲۔سوچاں ۱۹۸۳ء (پنجابی قطعات) ۳۔اکھراں ہتھ زنجیراں ۱۹۸۴ء (غزلاں ۔نظماں) ۴۔بقائے دوام ۱۹۸۶ء (خلیفہ امام دین بقا کی شخصیت فن اور شاعری) ۵۔کیف دوام ۱۹۸۸ء (مجموعہ نعت) ۶۔دشت تنہائی ۱۹۹۰ء (مجموعہ غزل) ۷۔چراغ آرزو ۱۹۹۲ء (مجموعہ نعت) ۸۔درد کی خوشبو ۱۹۹۴ء (مجموعہ نظم) ۹۔ غالب نکتہ بیں ۱۹۹۴ء (مضامین) ۱۰۔پرتوِ اقبال ۱۹۹۵ء (ترتیب) ۱۱۔شوق نیاز ۱۹۹۸ء (حمد و نعت) ۱۲۔شوکت واسطی فن اور شخصیت ۱۹۹۸ء (ترتیب) شامل ہیں۔ جبکہ ان کی کئی ایک کتابیں طباعت کے مراحل کی منتظر ہیں۔

سجاد مرزا کی تخلیقات پاکستان کے علاوہ دنیا بھر سے شائع ہونے والے اردو، پنجابی رسائل و جرائد اور اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔ سجاد مرزا ایک ہمہ صفت موصوف شخصیت ہیں۔ وہ لمحہ موجود کے ممتاز شاعر، ادیب نقاد اور محقق ہیں۔ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں خوب لکھتے ہیں۔ انہوں نے شعری اور نثری ہر دو میدانوں میں اپنی فکری اور فنی صلاحیتوں کے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ انہوں نے شعری چمنستان بھی سجایا اور وادی تحقیق و تنقید میں بھی اپنے حسین اور دلکش نقوش ثبت کیے۔

سجاد مرزا بنیادی طور پر ایک استاد ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، علم و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ لفظ آئینہ ان کے چھبیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ آیئے ان مضامین کا مختصر تعارف دیکھتے

Marfat.com

ہیں۔

ا۔سلیم اختر فارانی ۔۲۔آزادغزل ۔۳۔خلیفہ امام الدین بقا جالندھری ۔۴۔غالب کا ایک شعر ۔۵۔روایت شناس شاعر ۔۶۔رنگ ،خوشبو، روشنی کا شاعر، اختر ہوشیار پوری ۔۷۔نئے موسموں کا شاعر،ساحل احمد ۔۸۔نرمان ۔۹مشکِ منور ۔۱۰۔قطرہ اک لہو کا ۔۱۱۔مرکز یقین ۔۱۲۔ گنج ہائے گراں مایہ ۔۱۳۔ وقت لاوقت ۔۱۴۔ جادہ ءشوق ومحبت ۔۱۵۔ شام وسحر کے ادادیے ۔۱۶۔ پرتوِ غالب ۔۱۷۔شکیب جلالی، افسانے سے حقیقت تک ۔۱۸۔زادِ ہجر ۔۱۹۔ حضرت خواجہ کریم اللہ عباسی قادری کی غزل نگاری ۔۲۰۔انا پرست شاعر ۔راسخ عرفانی ۔۲۱۔اقبال ساجد اور اس کا اثاثہ ۔۲۲۔اداس لمحوں کا شاعر آنس معین ۔۲۳۔پرکھ پڑچول ۔۲۴۔میرے بزرگ میرے ہم عصر ۔۲۵۔عہد ساز شاعر ۔۲۶۔آب زار تمنا کا شاعر۔

اس فہرست پر نظر دوڑائیں تو ہمیں زیادہ مضامین ایسے ملتے ہیں جو کتابوں پر جائزے کی صورت میں ہیں اور کچھ ادبی شخصیات پر، سجاد مرزا کسی کتاب پر مضمون لکھیں یا شخصیت پر قلم اٹھائیں یا کسی اور موضوع کو احاطہ تحریر میں لائیں وہ اپنی تحریر میں اس شخصیت، کتاب یا موضوع کا مکمل احاطہ کریں گے اور ہمیں یہ احساس نہیں ہوگا کہ مضمون ادھورا ہے یا اس میں تشنگی رہ گئی ہے۔ وہ بہت سی جزیات کو جمع کرتے ہوئے جب اپنے مضمون کو اختتام تک لاتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے جو بات کی ہے وہ مکمل ہو چکی ہے۔ وہ خواہ مخواہ کے واقعات سے نہ تو مضمون کو طول دیتے ہیں اور نہ ہی کہیں اپنی بات کو تشنہ چھوڑتے ہیں۔ بلکہ تحریر کا پورا حق ادا کرتے ہیں گوجرانوالہ کے مشہور شعرا کے سلسلہ میں وہ سلیم اختر فارانی کا مکمل تعارف کروانے کے بعد ان کے فن پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''ابتدا میں فارانی صاحب کی شاعری روایت کی پاس داری کی آئینہ دار تھی مگر انہوں نے روایت کے ہیئتی اور اسلوبیاتی سانچوں میں دراڑیں نہیں ڈالیں بلکہ موضوعاتی سطح پر تازہ کاری اور ابتکار فکر سے اپنی تخلیقات کو ترفع سے ہم کنار کیا ان کی فارسی تخلیقات سوز وگداز،

Marfat.com

والہیت، سپردگی، نغمگی، سلاست، روانی اور جذبہ وفکر کے دل کش اجزا سے مملو ہیں ان کی اردو غزلیات بھی اسی ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ماجد الباقری عہد ساز شاعر میں سجاد مرزا کے قلم کی جولانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ماجد الباقری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ان کی شاعری کے حوالے سے اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ ماجد الباقری ہمیں واقعتاً ایک عہد ساز شاعر دکھائی دیتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ماجد الباقری کے تخلیقی اور فنی بحیروں سے ایک شناور کی طرح گوہر نایاب تلاش کیے ہیں اور اس طرح انہوں نے مُحہ تخلیق کی بازیافت کر کے ماجد الباقری کے موضوعات کا ادبی رس ہمارے لیے پیش کر دیا ہے۔ا۔عہد ساز ماجد الباقری سے چند اقتباسات۔۔۔

''ماجد الباقری کا ہاتھ اپنے عہد کی نبض پہچانتا ہے۔''

''ماجد الباقری کی شاعری میں مریضانہ انفعالیت نہیں بلکہ صحت مند معقولیت کا معروضی اظہار ہے۔''

''ماجد الباقری ادبی پنڈتوں کی سرپرستی کے بغیر خلوص سچائی اور خیر کی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے شعری سفر پر گامزن ہے۔''

''ماجد الباقری کا ردل اس زوال آمادہ معاشرے میں ایک تارک الدنیا فرد کا روپ اختیار کر چکا ہے۔''

''ماجد الباقری نے روایات کے پرانے تکنیکی سانچوں کو توڑ کر ابلاغ و ترسیل کے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔''

''ماجد الباقری کے ہاں جو تخلیقی تجربات ہیں وہ نئی دنیاؤں کی دریافت کا سراغ دیتے ہیں۔''

ایک اور اہم مضمون ''شکیب جلالی افسانے سے حقیقت تک'' میں سجاد مرزا نے جہاں س موضوع پر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے وہیں تحقیقی مواد بھی اس میں شامل کیا ہے۔جس سے اس

Marfat.com

مضمون کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مضمون کو لکھتے وقت انہوں نے تخلیقی شعور اور تحقیقی استعداد کو خوب استعمال کیا ہے اور ایک محققانہ تحریر سپردِ قلم کی ہے۔اس مضمون میں سے چند جملے دیکھتے ہیں۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ شکیب جلالی کی موت پر اپنی شخصیتوں کے چراغ جلانے والے لوگ وہ ہیں جو پہلے ہی اچھے خاصے معروف ہیں۔شکیب جلالی کے سوانح نگاروں نے ظن وتخمین پر اپنے اپنے مضامین کی عمارت کھڑی کی ہے۔راقم (سجاد مرزا) اس بات کی تحقیق کر چکا ہے کہ ماجدالباقری شکیب کے استاد ہیں جناب سرور مجاز نے اس کی تصدیق کی ہے۔

بھکر سے خواجہ قریش علی منشانامی ایک شخص نے شکیب جلالی کے بارے میں ''خورشید سخن'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اس کتاب کے بارے میں خلش صہبائی نے ایک سوال کے جواب میں بتایا۔

''اس کتاب کو شائع کرنے والا شخص انتہائی پست معیار کا شاعر ہے۔اس نے اپنے آپ کو شکیب کا دوست ظاہر کر کے اپنا قد بڑھانے اور خاص طور پر خلیل رام پوری کو آڑ دینے کے لئے یہ کتاب تحریر کی ہے''

سجاد مرزا نے اپنے مضامین میں ایسی ادبی شخصیات کا چناؤ کیا ہے جن میں معروف اور غیر معروف دونوں طرح کی شخصیات موجود ہیں۔جس سے ان کے مضامین میں ایک تنوع کا احساس پیدا ہوا ہے اور ان مضامین میں ایسی رنگارنگی پیدا ہوئی ہے جو ہمیں یکسانیت سے دور رکھتی ہے۔مضامین میں الفاظ کی سادگی، توانائی، خوش آہنگی بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ رکھتی ہے۔

''اداس لمحوں کا شاعر، آنس معین'' میں سجاد مرزا نے آنس معین کا غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا اس میں انہوں نے آنس معین کا تجزیہ سماجی شعور، اقتصادی اور تہذیبی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے انہوں نے ایک سچے اور کھرے نقاد کی حیثیت سے آنس معین کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

Marfat.com

''آنس معین کے تخلیقی'' تجربات اس کی انفرادیت اور غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ اس کی شاعری میں متصوفانہ اور فلسفیانہ نکات کا سراغ تلاش کرنا اس کی تضحیک کے مترادف ہے۔ آنس معین کو رومی، سقراط، ارسطو، کیٹس، شکیب، جلالی اور مصطفیٰ زیدی وغیرہ سے مماثلت و مشابہت دینا اس کے خیالات، افکار اور سوچوں کا موازنہ مذکورہ افراد سے کرنا اس کی توہین ہے۔ ایسی باتوں سے اس کی شاعری کا رتبہ کم کیا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپنی فکر مضمحل ہے وہ ایک مریضانہ انفعالیت کا شکار ہے۔ اس کی شاعری دوسروں کے خیالات و افکار کی بازگشت ہے''

''آنس معین کی لفظیات، اس کے شعری تلازمات، اس کی تراکیب اور خوبصورت بندشیں اس کے شعر کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں اس کے لہجے کی گھمبیرتا، دھیرے دھیرے سلگنے کا عمل اور اسکا پیرایہء اظہار اس کی شاعری کی شناخت ہے''۔

لفظ آئینہ میں زیادہ مضمون کتابوں پر جائزے کی صورت میں ہیں۔ یہ کتابیں شاعری، افسانہ، سفرنامہ، تنقید، تاریخ اور سوانح پر مشتمل ہیں۔ یہاں ہم ان مضامین میں سے چند ایک مضامین کو سجاد مرزا کے تنقیدی معیار اور اسلوب کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''جادہء شوق و محبت شاکر کنڈان کا حجاز مقدس کا جمال آفرین سفرنامہ ہے۔ اس سفر نامے میں شاکر کنڈان نے صدیوں کے سفر کو لمحوں میں سمیٹ کر اپنے مشاہدے کی گہرائی، باریک بینی اور تیز رفتاری کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ شاکر کنڈان ہمیں ایک زیرک سیاح کے روپ میں تو نظر آتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک درویش صفت اللہ لوک بھی ہے''

مرزا غالب کے بعد رشید احمد صدیقی کو یہ اعزاز و کمال حاصل ہے کہ ان کی رسیلی اور بے شکن نثر پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جب کوئی قاری ان کا کوئی سا بھی مضمون شروع کرے اور پڑھ کر ختم نہ کر لے یہ گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے صدیقی صاحب اپنے قاری پر سحر طاری کر دیتے ہیں، اس کی خوبصورت مثال گنج ہائے گراں

Marfat.com

مایہ ہے۔

''علی احمد شاہد ایک ایسے پختہ فکر افسانہ نگار ہیں جنہوں نے زندگی کی ہر جہت کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا ہے۔ان کی کہانیاں ان کے افسانے زندگی کے آئینے ہیں جن میں ہر شخص حسبِ توفیق اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔وہ چہرہ خوبصورت ہے یا مکدر یا اس میں کجی ہے تو الزام آئینہ بردار پر آئے گا مگر آئینہ بردار کسی کا دید لحاظ نہیں کرتا وہ تو لوگوں کو ان کی صورتیں جیسی بھی ہیں دکھاتا چلا جاتا ہے۔اس کی چال وقت کی چال ہے اس کا فیصلہ وقت کا فیصلہ ہے اور وقت کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا ہے''

''سماجی سطح پر اگرچہ ناکامیاں اس کا مقدر تھیں۔لیکن ادبی سطح پر اس کے فن کا سکہ رواں تھا اقبال ساجد کی شاعری کے سکہ رائج الوقت پر کتنے ادبی سوداگروں اور نظام سقوں نے اپنا نام کندہ کروانے کی کوششیں کیں اور صلے کے طور پر اس کا چاک دامن بھی رفو نہ کر سکے۔''

میرے بزرگ میرے ہم عصر یہ کتاب آتی تو شخصیت نگاری کی ذیل میں ہے لیکن خاکہ نگاری کے تناظر میں بھی اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ان خاکوں میں رنگ، ڈھنگ اور آہنگ ڈاکٹر وفا صاحب کا اپنا ہے۔یہ خاکے آج کی بے راہ رو نسلِ نو کے لئے لمحہ فکریہ مہیا کرتے ہیں جو اپنے بزرگوں کے آثار کی عظمتوں سے بیگانہ اور لاتعلق ہوتی جا رہی ہے۔یہ خاکے جن میں متنوع رنگ ہیں۔دینی، سیاسی، اور ادبی شخصیات کی فکری زندگی کا ایک گراں بہا اثاثہ ہیں۔

''افتخار نسیم نے اپنے نرمان کو منظرِ عام پر لا کر جس سچ کا زہر پیا ہے وہ میرے یا آپ کے بس کی بات نہیں۔افتخار نسیم اپنے راز اپنے آپ سے بھی اک عمر چھپا کر جیتا رہا ہے۔اس نے نرمان کی صورت میں اپنے تجربات ہی بیان نہیں کیے بلکہ ان پر یقین کی مہریں بھی ثبت کی ہیں۔

ان چند اقتباسات سے ہمیں لفظ آئینہ میں شامل وہ مضامین جو کتابوں کے جائزے کی صورت میں لکھے گئے ہیں ان سے کچھ آگاہی حاصل ہوئی ہے۔آپ نے دیکھا کہ ان جملوں کے پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں یہ خواہش جنم لیتی ہے کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرے جس

Marfat.com

کے بارے میں سجاد مرزا نے یہ جملے تحریر کیے ہیں یہی کامیابی سجاد مرزا کے فن تحریر کی خصوصیت ہے
سجاد مرزا جیسے طبعاً نفاست پسند صلح جو، حلیم اور دوست نواز آدمی ہیں۔ اسی طرح ان کے طرز نگارش میں بھی خوبصورتی، دلآویزی، ندرت اور اور تفکر کی لہریں موجود ہیں ان کے ہاں تحریر میں جہاں بے ساختگی ہے وہاں کاوش فکر بھی ہے۔ ان کی فکر کا پیمانہ بلند، نظر کا معیار ارفع اور ارجمند رہتا ہے۔ کہیں کہیں لہجہ میں کاٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ان کی تحریر کا عمومی لہجہ بڑا بے تکلفانہ اور خلوص کی فضا لیے ہوئے ہے۔

سجاد مرزا غالب سے متاثر ہیں ان کا کہنا ہے کہ غالب کی شاعری میں جو بنیادی انسانی نفسیات اور رویوں کی بات ہے اس نے اسے آفاق گیر شاعر بنا دیا ہے۔ اس کی شاعری آنے والی صدیوں کو بھی محیط ہے۔ وہ آج کا بھی شاعر ہے اور مستقبل کا بھی اس کی فکر کا چراغ بجھ نہیں سکتا غالب کو حیات دوام حاصل ہے۔

لفظ آئینہ میں انہوں نے غالب کے حوالے سے بھی دو مضمون شامل کیے ہیں۔ (۱) پرتوِ غالب، (۲) غالب کا ایک شعر۔ یہ دونوں مضمون اُن کی غالب سے محبت اور عقیدت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پرتوِ غالب میں سجاد مرزا لکھتے ہیں۔

جن حضرات نے غالب کے رنگ کی پیروی کی ہے وہ اس رنگ کی حد تک تو کامیاب ہیں لیکن غالب کے اسلوب خاص میں جو تہہ داری اور خیال آفرینی ہے وہ ان کے یہاں مفقود ہے
ان سطور کے بعد سجاد مرزا کہتے ہیں اور کسی کا کیا ذکر شاعر مشرق علامہ اقبال نے بھی غالب سے بہت استفادہ کیا ہے اور ان کی بیشتر فارسی تراکیب اور تشبیہات سے غالب کا انداز بیاں جھلکتا ہے
مثال کے طور پر یہ شعر ہی غالب کے انداز بیاں کی نشاندہی کرتا ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہاں ان کی غالب سے محبت اور عقیدت زیادہ گہری ہوگئی ہے۔ لیکن ایک شعر کی مثال نا

Marfat.com

کافی رہی ہے۔ کیونکہ جتنے بڑے شاعروں کی بات ہے اتنی زیادہ مثالوں کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ غالب کا ایک شعر سجاد مرزا کا ایک اور خوبصورت مضمون ہے۔ جس میں درج ذیل شعر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

اس شعر کی تشریح میں نیاز فتح پوری، مولانا عبدالباری آسی، مولانا حسرت موہانی، بے خود دہلوی، نظم طباطبائی، مولانا غلام رسول، مہر کی تشریحات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس مضمون میں سجاد مرزا غالب کو اس طرح خراج محبت پیش کرتے ہیں۔

''غالب کے ہاں تفکر کی انتہا، بے پناہ طباعی، خلاقی اور جدت طرازی ہے۔ غالب نے فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی الگ راہ پیدا کی ہے اور بیان کے نئے نئے زاویے تلاش کیے۔ غالب کے ہاں تصوف و حکمت بھی ہے پند و نصائح بھی اور عاشقانہ رنگ بھی لیکن ہر رنگ میں اس کی شوخی و بے باکی اور بلندیٔ تخیل کارفرما ہے اور معنوی نزاکتوں کے جو مرقعے غالب نے سجائے ہیں ان کی مثال ملنا محال ہے''

اِن تمام مضامین کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سجاد مرزا کا اسلوبِ نگارش بڑا متنوع، جاندار اور ماہرانہ ہے۔ اُن کی زبان میں شستگی، روانی، نغمگی اور تاثیر ہے۔ وُہ اِس بات کا خوب ادراک رکھتے ہیں کہ قاری کو بوجھل تحریر تلے نہ دبایا جائے۔

اسی لیے وہ اپنی ہر بات میں بے تکلفی کی فضا قائم رکھتے ہیں اور سادگی اظہار سے طرز تحریر میں دلکشی توانائی گرمجوشی بھرتے چلے جاتے ہیں اور قاری کو اپنے اصل ہدف کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ ان کی تحریر کا یہ فاضلانہ اظہار ان کی فنکارانہ عظمت کی دلیل او ان کی کامیابی کا سنگِ میل ہے اور لفظ آئینہ اس کا خوبصورت اظہار ہے۔

Marfat.com

بسلسلہ گوجرانوالہ کے فارسی گو شعرا

سلیم اختر فارانی

سلیم اختر فارانی صاحب نصف صدی سے شاعری کے دشت کی سیاحی میں بڑے عزم جواں اور بلند حوصلے سے تیز گامی سے رواں دواں ہیں۔ وہ ایسے درویش صفت انسان ہیں جن کی زندگی کا نصب العین صرف اور صرف محبتیں بانٹنا اور نفرتوں کی خلیج کو پاٹنا ہے۔ جو شخص زندگی میں ایک بار اُن کے قریب آیا، وہ انہی کے دامِ محبت و شفقت میں گرفتار ہو کے رہ گیا۔ کئی لوگ بغل میں تیغِ خصومت چھپا کر ان کی محفل میں آئے، اٹھے تو دامن جھٹک کر اٹھے اور ان کی شخصیت و محبت کے سحر میں ایسے مبتلا ہوئے کہ فارانی صاحب کی مخالفت کے بارے میں سوچنا بھی انہوں نے گناہ کبیرہ سمجھا!

ہمیں وہ دور بھی یاد ہے جب گوجرانوالہ کے شعرا اور ادباء مختلف دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک بزم سے تعلق رکھنے والے شعراء دوسری بزم کے مشاعرے میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ہر بزم نے اپنے اراکین پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ جب لوگ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنے میں مصروف تھے تو ایسے دورِ ابتلا میں سلیم اختر فارانی صاحب نے سفیر محبت کا فریضہ انجام دیا اور مخالفتوں کے حصار توڑ کر شاعروں کو ایک دوسرے کے قریب کیا۔

سلیم اختر فارانی رانا عبدالغنی خان (مرحوم) کے گھر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ہوشیار پور (بھارت) کے معزز راجپوت خان دان سے ہے۔ ہوشیار پور وہ مردم خیز خطہ زمین جہاں بہت سے نام ور لوگ پیدا ہوئے۔ ان نابغہ روزگار ہستیوں میں سے چند نام ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں جو کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے: مولانا گرامی، چودھری رحمت علی، چودھری

Marfat.com

افضل حق، مولوی غلام رسول (عالم پوری)، ہری چند اختر، حفیظ ہوشیار پوری، گوہر ہوشیار پوری، اختر ہوشیار پوری، حمید ہوشیار پوری، طفیل ہوشیار پوری، ساحر ہوشیار پوری، مرزا خادم ہوشیار پوری، حبیب ہوشیار پوری، عارف ہوشیار پوری، اکرام ہوشیار پوری، ایس ایس پروانہ، حبیب جالب، منیر نیازی، یعقوب طاہر، اختر حسین جعفری، ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری، پریم کمار نظر اور سلیم اختر فارانی ایسے درخشندہ ستاروں کا تعلق ہوشیار پور کے آسمان سے ہے۔

فارانی صاحب نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول ہوشیار پور سے حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ تاریخ اسلام ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ ان کے تاریخی افسانے آج بھی قابل مطالعہ ہیں۔

الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد انہوں نے برٹش انڈین آرمی میں اپنی سروس کا آغاز کیا اور کئی سال اس سلسلہ میں آگرہ شہر میں گزارے۔ ان دنوں آگرہ (اکبرآباد) کے شعراء کا پورے برصغیر میں چرچا تھا۔ فارانی صاحب وہاں منعقد ہونے والے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے۔ اس دور کے شعراء میں سیماب اکبرآبادی، اخگر اکبرآبادی، صبا اکبرآبادی، میکش اکبرآبادی اور عزم اکبرآبادی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ فارانی صاحب نے ان نامور اہل دانش کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ اساتذہ فن کو دیکھا اور سنا۔ اس سنہرے دور کے چند اشعار سے لطف اٹھائیے:

انہیں بھی یاد کر، دم توڑنے والے مسہری پر
بیاباں میں جو تپتی ریت پر دیتے ہیں جاں اپنی

سیماب اکبرآبادی

دیکھا ہے ہم نے حادثہ، برق و آشیاں
بل کھا کے اک دھواں سا اجالے میں رہ گیا

Marfat.com

عزم اکبر آبادی

کم ہو گی جب چراغ محبت کی روشنی

دل کو جلا جلا کے اجالا کریں گے ہم

ادب اور فنون لطیفہ کے جن شعبوں میں سلیم اختر فارانی صاحب نے کمال حاصل کیا، ان میں افسانہ نگاری، شاعری اور مصوری کے شعبے سرفہرست ہیں۔ مصوری میں ان کے کئی نام ور شاگرد ہیں۔ شاعری میں انہوں نے بہت سے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کی لیکن کبھی اپنے آپ کو استاد کہلانے کا روگ نہیں پالا۔ بلکہ کمال محبت سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو باہمی مشاورت ہے۔ یہ استادی شاگردی کا سلسلہ نہیں! ہم نے وہ استاد بھی دیکھے ہیں جو اپنی استادی کا جھنڈا اپنے ہی ہاتھوں میں اٹھائے پھر رہے ہیں اور جن معروف شاگرد شعرا کا حوالہ دیتے ہیں کہ وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان شاگردوں کے پائے کا ایک شعر بھی ان کے عمر بھر کے اثاثے میں نہیں!

قیام پاکستان (۱۹۴۷) کے بعد فارانی صاحب نے گوجرانوالہ کو اپنا مسکن بنایا یہاں آ کر اپنے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کیلئے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فاضل فارسی اور فاضل اردو کے امتحانات یکے بعد دیگرے پاس کیے اور شعر گوئی کی طرف توجہ دی۔ شہر کی مشہور ادبی انجمن، بزم اقبال گوجرانوالہ میں شرکت کی۔ جس کے روح رواں غلام یعقوب انور، مولانا راسخ عرفانی، شرقی چاند پوری، مائل کرنالی، صوفی غیرت قادری اور پروفیسر اسرار احمد سہاوری تھے۔ افسانہ نگاری اور شاعری کے ساتھ ساتھ فن مصوری میں بھی انہیں کامل دست گاہ حاصل ہے۔ ان کے نقش کیے ہوئے تاریخی شاہکار ان کی گیلری میں آج بھی آویزاں ہیں۔

ان دنوں گوجرانوالہ شہر میں طرحی مشاعروں کا بہت زور تھا اور اکثر شعراء میں معاصرانہ چشمک بھی تھی۔ اس کے نتیجے میں ''بزم اقبال'' دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اب شہر میں بزم اقبال رجسٹرڈ اور مرکزی بزم اقبال کے ناموں سے دو انجمنیں اپنے اپنے مشاعرے برپا کر رہی تھیں۔ سلیم اختر فارانی صاحب بزم اقبال رجسٹرڈ میں جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

Marfat.com

لیکن کچھ عرصہ بعد دونوں بزموں کی چپقلش سے بیزار ہو کر الگ ہو گئے۔ جب ان کی کاوش سے دونوں بزمیں ایک بار پھر ایک دوسری میں ضم ہو کر ایک ہو گئیں۔ تو وہ مرکزی بزم اقبال میں آ گئے اور ایک مدت تک اس قدیم بزم کے صدر رہے۔

گوجرانوالہ شہر میں مشاعرے باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ کبھی ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں، کبھی کمیٹی ہال میں اور کبھی مختلف احباب کے گھروں میں، واہ واہ کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں، ماشاءاللہ، سبحان اللہ کی مترنم صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ شاعر ہیں کہ کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں۔ اس دور میں محبت خلوص اور ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کے جذبات فراواں تھے۔ کبھی کبھی فارانی صاحب اور راسخ عرفانی (مرحوم) دوسرے شہروں کے شعراء کو بھی اپنے مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ ان میں ساحر صدیقی، علامہ لطیف انور، کبیر خان رسا جالندھری، عبدالحمید عدم، طفیل ہوشیار پوری، عارف عبدالمتین، انور مسعود، جانباز مرزا، مظفر وارثی اور سید امین گیلانی کے نام یاد آتے ہیں۔ ان کاوش ہائے جلیلہ سے شہر کی ادبی فضائیں شعر و نغمہ سے معمور رہتی تھیں۔

مرکزی بزم اقبال گوجرانوالہ کے یہ مشاعرے نئے لکھنے والوں کی تربیت گاہیں تھیں۔ شعراء کے علاوہ ادبی لگاؤ رکھنے والے حضرات کا ہجوم بھی رہتا تھا۔ بیشتر کہنہ مشق اور استاد شعراء اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر چکے ہیں۔ کچھ پیرانہ سالی کے باعث ان ہنگاموں سے کنارا کشی کیے ہوئے ہیں اور بعض مختلف حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ صرف سلیم اختر فارانی صاحب کا دم غنیمت ہے کہ دل کی بیماری اور ضعف بصارت کے باوجود ہر حلقے میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی اپنی انجمن، مرکزی بزم اقبال گوجرانوالہ کے دروازے سب پر کھلے رہتے ہیں۔ شہر کے معروف شعراء کا تعلق اسی بزم سے ہے۔

آنکھوں کے سامنے عہد ماضی کے حسین مناظر آج بھی رقص کناں ہیں۔ ہونٹوں پر محبت اور شفقت کی مسکراہٹیں سجائے ان بزرگوں کی نورانی صورتیں میرے خوابوں کے شیش محل

Marfat.com

کے حسین جھروکوں سے آج بھی جھانکتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ جیسے ابھی ابھی باتیں کرتی ہوئی خاموش ہوگئی ہوں۔ ''اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں''۔ شرقی چاند پوری، صوفی غیرت قادری، غلام یعقوب انور، راسخ عرفانی، مائل کرنالی، محمد علی فائق، یعقوب طاہر، آزاد باجوہ، حکیم نذیر احمد کیف، غیرت رومانی، آثم بزمی، چوہدری منظور، م ع عارف، ملک منظور، حافظ یعقوب ندیم، کوثر جموی، شہید جالندھری، اثر لودھیانوی، قمر دہلوی، اسماعیل داوٗدی، شاکر سہارن پوری، اختر کنجاہی، خیر پانی پتی، بیکس فتح گڑھی، افضل طور، شاد کاشمیری، خلیفہ امام الدین بقا جالندھری، میراں شاہ ہمدانی، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، ارشد میر، محمد دین فانی، عزیز گل، خورشید عالم، راز صدیقی، شوکت زاہدی، شاد قددائی، نسیم آزاد، ہوش لودھیانوی، شاکر کنجاہی، عارف میرٹھی، منظور کلیم بٹالوی، ابراہیم راز، انور خاکسار، صدیق صابر اور ماجد الباقری ایسے رخشندہ ستارے کبھی نہ ابھرنے کیلئے ڈوب گئے لیکن اپنے پیچھے علم وادب کی ایسی منور کرنیں چھوڑ گئے جو آنے والی نسلوں کو روشنی مہیا کرتی رہیں گی۔

سلیم اختر فارانی صاحب اسی کہکشاں کے تابندہ ستارے ہیں جو عصر حاضر کے اس ماحول کو منور کیے ہوئے ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں بیان کا حسن، اسلوب کی تازگی، فکر کی رفعت اور جذبات کی شدت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے اردو کلام میں فارسی کی حلاوت خوب لطف پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ان کی نوائے شوق میں کیف وسرور کی سرمستی اور ذوق سرمدی کی جولانی کا احساس فراواں ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔ ان کے نعتیہ مجموعہ ''نغمہ فاراں اور ضیائے ہفت رخشاں'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے نعت، نظم، غزل اور آزاد نظم کے علاوہ جو قابل قدر اور عظیم کام شروع کر رکھا ہے، وہ قرآن حکیم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ چھ پاروں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس کام کی تکمیل کیلئے فارانی صاحب کو صحت وتوانائی عطا فرمائے۔ (آمین) ان کے فارسی کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:

Marfat.com

نعت

سرودی من سرایم منتہای دل نمی باشد
مقامِ جذب و سرمستی ازیں حاصل نمی باشد

☆☆☆

بدہ ساقی مئی کوثر ، شفق را سحر زا بیمؑ !
کہ فردوسِ خیالِ من بدوں کامل نمی باشد

☆☆☆

نمی جنبد چرا ایں قافلہء ملتِ بیضا !
چرا سوی گلستانِ حرا مائل نمی باشد

☆☆☆

دلِ من از فروغِ شمع احمدؐ روشنی گیرد
دریں ظلمت ، ضیای ماہ و خور داخل نمی باشد

☆☆☆

فقیہانِ کلیسا ! ہم ثنای مصطفیؐ گویند
کہ انکارِ نبوت از کسی عاقل نمی باشد

☆☆☆

اگر چہ نوریانِ عرش قربِ ذات می دارند
نشانِ کبریا جز انبیاء حاصل نمی باشد

☆☆☆

بیا بامن اگر خواہی حیاتِ جاوداں اختر
بجز کوی نبیؐ تسکینِ جاں حاصل نمی باشد

Marfat.com

ابتدا میں فارانی صاحب کی شاعری روایت کی پاس داری کی آئینہ دار تھی مگر انہوں نے روایت کے ہیتی اور اسلوبیاتی سانچوں میں دراڑیں نہیں ڈالیں، بلکہ موضوعاتی سطح پر تازہ کاری اور ابتکار فکر سے اپنی تخلیقات کو ترفع سے ہم کنار کیا۔ ان کی فارسی تخلیقات سوز و گداز، والہیت، سپردگی، نغمگی، سلاست، روانی اور جذبہ و فکر کے دل کش اجزا سے مملو ہیں۔ ان کی اردو غزلیات بھی اسی ہنر مندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی اردو غزل کے دو اشعار بطور نمونہ دیکھئے اور پھر فارسی کلام پڑھیئے۔

محبتوں میں جو جل بجھے ہیں، انہی دیوں کی مثال دینا
وفا کی تیرہ و تار راہیں، چراغ دل سے اجال دینا

☆☆☆

جھیل سی آنکھیں شناسا ہوگئیں
ہم کو پانی میں اترنا آ گیا!

غزل

نسیم صبح آمد، راحتِ جان و مشام آمد
زکوی جانِ جاں گوی، بسوی من سلام آمد

☆☆☆

خزاں رخصت شدو، باد بہار جاں فزا آمد
چوں آں سروِ بہارِ من بگلشن درخرام آمد

☆☆☆

بیا بہ بام تابنی ستم ہای جمال خویش
بکوی تو خمیدہ سر یکی لرزیدہ گام آمد

Marfat.com

زباں دارم ولی تاب زبان دانی نمی دارم
بگو آں مہربانی رایکی تشنہ کلام آمد

☆☆☆

ببیں اشعارِ رنگین باز پیشِ مجلس اقبال
بیامد راسخ و انور ، نسیم خوش کلام آمد

☆☆☆

سر آمد عمرِ کوتاہ اندریں زیرو فراز اختر
گہی صبح مسرت شد ، گہی حرمانِ شام آمد

غزل

یک الف دارم نہ دارم ہیچ سامانِ دگر
تا چہ انجامد خدایا ! در دبستانِ دگر

☆☆☆

سر بسجدہ می کنم برآستانِ مہ وشی
باز دارم بر جبینم داغِ عصیانِ دگر

☆☆☆

چند خواہی شد پردہ ای طبیب خوش ادا
جز ترا ای جانِ جاناں نیست درمانِ دگر

☆☆☆

دیدہ ام آں روضۂ رضواں ولی دراں جہاں
رشکِ صد خلدِ بریں ، بینم گلستانِ دگر
من گدای کوی یارم ، من فقیر بی نوا

111282

Marfat.com

جز تہی داماں ندارم ، ہیچ سامانِ دگر

☆☆☆

اختر مہجور را پرسم دریں شہر غزل
نی شناسم من بجزآں سوختہ جان دگر

غزل

ببیں محرومی رنداں کہ دور جام آخر شد
سرور مئے کشی رفت و می گلفام آخر شد

☆☆☆

کجا منزل ، کجا دودِ چراغِ راہ منزل بود
بیادِ تند و تیز ای جاں چراغِ شام آخر شد

☆☆☆

صدای قلقلِ مینا بروں آمد ز می خانہ
چوں آمد ساقی مہ وش سکوتِ جام آخر شد

☆☆☆

سر آمد شدت ہجراں نفس چوں آخریں آمد
مریض غم چوں رفت از جاں شب آلام آخر شد

☆☆☆

چوں آمد آں نگارِ من میانِ گلشن ہستی !
خزاں رفت و بہار آمد غم ایام آخر شد

☆☆☆

سرا پا خوابِ غفلت بود دور عاشقی اختر

Marfat.com

ازیں پندار بیداری ، خیال خام آخر شد

غزل

بحمداللہ کہ من سرِ نہاں را ہم عیاں بینم
بہر روضہ ، بہر گلشن بہار بی خزاں بینم

☆☆☆

چراغِ نور را چوں ہر جبینش زر فشاں بینم
باندازِ دگر گوئی ، ضیائی کہکشاں بینم

☆☆☆

رخِ محبوب امشب از رخِ مہتاب روشن تر
گہی سوی جبینش، گاہے سوی آسماں بینم

☆☆☆

ببیں ایں معجزہ آمدِ فصلِ بہاراں بیں
بہر سو رقصِ گل بینم ، بہر سو گلستاں بینم

☆☆☆

سر آمد تیرگیٔ دل ، بفیضانِ جمالِ او !
بہر سو آفتاب و ماہتابِ ضوفشاں بینم

☆☆☆

چہا جشن طرب بینم ، چہا بینم جمال نو
اُفق تا با افق چہ نورو نکہت پُرفشاں بینم

☆☆☆☆☆

Marfat.com

آزادغزل

جن دنوں ادبی دنیا، ہمایوں، ادب لطیف، سویرا اور ساقی ایسے معتبر رسائل میں ہیت کی تبدیلیوں سے نئے رنگ و آہنگ کی نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں، ان سے نئے لکھنے والے بطور خاص متاثر تھے۔فروری 1945ء میں مظہرامام نے انہی نظموں کے زیر اثر، ارکان کی کمی بیشی سے آزاد غزل کا تجرباتی ڈول ڈالا لیکن آزادغزل کہیں چھپنے کیلئے نہیں بھیجی۔انہیں تضحیک کا اندیشہ تھا۔یہ آزادغزل پہلی بار سہ ماہی ''رفتارِنو'' دربھنگا کے 1962ء کے سالنامے میں اشاعت پذیر ہوئی۔

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینہ آپ ہیں

☆☆☆

آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے افق پر جگمگایا جو ستارا آپ ہیں

☆☆☆

کیوں نگاہوں نے کیا ہے آپ ہی کا انتخاب؟
کیا زمانے بھر میں یکتا آپ ہیں؟

☆☆☆

میری منزل بے نشاں ہے لیکن اس کا کیا علاج
میری ہی منزل کی جانب جادہ پیما آپ ہیں

☆☆☆

Marfat.com

ہائے وہ ایفائے وعدہ کی تحیر خیزیاں

ان کی آہٹ پر ہی گھر کا کونا کونا چیخ اٹھا تھا کہ ''اچھا آپ ہیں''؟

اکتوبر 1962ء میں مظہر امام کا شعری مجموعہ ''زخم تمنا'' شائع ہوا تو اس میں یہ پہلی آزاد غزل بھی شامل تھی۔ یہ تجربہ شعوری تھا اور مظہر امام کے پیش نظر اردو کی آزاد نظموں کے معتبر نمونے تھے۔

جنوری 1968ء میں کرشن موہن کا مجموعہ ''غزال'' منظر عام پر آیا تو اس میں بھی ایسی ہی تین تجرباتی غزلیں شامل تھیں۔

وصل رنگین کا مزہ اتنا نہ لوٹ

آگہی و ہوش کا رشتہ ہی جس سے جائے ٹوٹ

☆☆☆

مت سمجھ اس کی وفا کو جھوٹ موٹ

ایسے اکثر عشق میں تقدیر بھی جاتی ہے پھوٹ

کرشن موہن کی غزل کے دو شعر اور دیکھیے۔

کیا عالم ہے اب ہوش نہیں سنتوش نہیں

بے چین بھی ہوں، مدہوش بھی ہوں، نشہ بھی پردہ پوش نہیں

☆☆

افسر ہونا کیا فن کی عظمت کھونا ہے؟

میں شاعر ہوں اور افسر بھی، اس میں کچھ میرا دوش نہیں

علیم صبا نویدی کی آزاد غزلوں کا مجموعہ ''ردکفر'' 1978ء میں شائع ہوا جو اردو میں آزاد غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

شکوہ کیا تقدیر کا

جب نہیں پیراہن کا غذ مری تقدیر کا

Marfat.com

ٹوٹتا جاتا ہوں میں

زخم خوردہ راہ غم میں ہے قدم تدبیر کا

1979ء میں فارغ بخاری نے تجرباتی غزلوں کے حوالے سے ایک کتاب ''غزلیہ'' کے نام سے دنیائے ادب میں پیش کی، لیکن اس میں جو تجربات کئے گئے ہیں، آزاد غزل کی ہیت میں کوئی ایک غزل بھی نہیں۔ ان کی معریٰ غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

زرد پتوں کو بھی ہے تازہ ہواؤں کی طلب

ہر مسافر اک نئی منزل کا راہی ہے یہاں

☆☆☆

جانے کب سے ہوں معلق زندگی کی لفٹ میں

اب زمیں کی بات کرنے سے بھی شرماتے ہیں لوگ

اگست 1980ء کے ''افکار'' کراچی میں قتیل شفائی کی چار تجرباتی غزلیں شامل تھیں۔

رات کے رنگ رسیلے کب تھے

مجھ کو حاصل ترے وعدوں کے وسیلے کب تھے

☆☆☆

مجھ پہ طاری تھا خود اپنا ہی خمار

میری آنکھوں میں ترے خواب نشیلے کب تھے

قتیل شفائی کے مجموعہ کلام ''آموختہ'' میں ان کی چھ آزاد غزلیں بھی ہیں۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن سے دو آزاد غزلیں پیش کروائیں جن میں صوت و ساز کا نہایت خوبصورت امتزاج تھا۔

فرحت قادری نے 1981ء میں یہ تجربہ کیا۔

یقین ہے

Marfat.com

یہاں کچھ نہیں ہے

خلاؤں کا دامن ہے خالی

جو میں ڈھونڈتا ہوں وہ زیر زمیں ہے

مرے خواب اب پلتے پلتے جواں ہو گئے ہیں

ہر اک سانس میں ایسی سوزش ہے کہ گویا لب آتشیں ہے

مثالوں کی دنیا میں ہر شے کی تشبیہ ممکن ہے مل جائے لیکن

مری دھڑکنوں کا جو عالم ہے اس کی زمانے میں کوئی تشبیہ نہیں ہے!

☆☆☆

پرویز رحمانی نے آزاد غزل، تجرباتی غزل یا غزل نما کو ''گیتل'' کا نام دیا جو گیت اور غزل کا مخفف ہے۔ ان کی گیتل کے چند شعر دیکھئے۔

کھلے پڑے ہیں مرے آگے برہ کے اشٹ ادھیائے

مت کر اب انیائے

اب تو سونا پن بھی اکیلا پا کر کاٹنے دوڑے

رات الگ وہلائے

میں بھی چنتا وشے ہوں پیتم

کون تجھے سمجھائے؟

ہو کر بھی نہیں ہوں تیری

من کو لگتی ہے سچ مچ میں رحمانی جی کی رائے

1981ء میں شان الحق حقی نے اپنے مجموعے ''حرف دل رس'' میں دو تجرباتی غزلیں، غزل نما کے عنوان سے شامل کیں:

شام وعدہ کی وہ سرمئی سی کی فضا

Marfat.com

رسمی روشنی

بادلوں میں سے چھنتی ہوئی چاندنی

تیری آمد کے لمحے پگھلتے رہے

شمع جلتی رہی

رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی

کئی شعراء نے بے قافیہ غزلیں لکھنے کے تجربات بھی کئے ہیں۔ اوم کرشن راحت کی ایسی ہی ایک غزل ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ کے دسمبر 1993ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوئی۔

خود کو جب دیکھا ہے حالات کی چھت سے ہم نے

خود کو پہچان لیا اپنے ہی قد سے ہم نے

رنگ کیا لائے گی جرات یہ ہماری، دیکھیں

دھولیا اپنا قلم رنگ شفق سے ہم نے

بعض شعراء نے نثری غزل لکھنے کا تجربہ بھی کیا ہے لیکن اس کا اتباع نہیں ہو سکا۔ بشیر بدر کی نثری غزل کا نمونہ حاضر ہے۔

میں سب کے سامنے شوکیس کی عورت کے سینے پر اپنے ہونٹ رکھوں گا

اور مجھے یہ دیکھنا ہے کہ پتھر کی چھاتی میں کیسے دودھ نہیں اترتا؟

ماہنامہ ''صریر'' کراچی کے سالنامے 1994ء میں مظہر امام'' آزاد غزل پر ایک نوٹ'' (صفحہ 98 پر) رقم طراز ہیں:

''میں نے اپنے مضمون'' آزاد غزل پر ایک نوٹ'' میں لکھا تھا کہ آزاد غزل ایک اچھوت صنف سخن ہے۔ اونچی ذات کے شاعر اور نقاد آزاد غزل کو ادب کے مندر میں داخل ہونے کی اجازت دینا نہیں چاہتے۔ یہ بات میں نے 1981ء میں کہی تھی۔ اب میرا خیال ہے کہ آزاد غزل کے تعلق سے برگزیدہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کے انداز نظر میں نرمی آ رہی ہے اور

Marfat.com

مخالفت کی تندی کم ہوتی جا رہی ہے۔ آزاد غزل کہنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اسے اچھوت صنف سخن نہیں سمجھا جا رہا اور ناقدوں کی عدم پذیرائی کے باوجود اگر شعرا اس صنف کی جانب متوجہ ہو رہے ہیں تو اس کی صنفی خوبی کی وجہ سے ورنہ ناقدوں کی جانب سے انہیں ستائشی کلمات کے نذرانے تو ملنے سے رہے۔''

اس وقت تک برصغیر کے دو سو سے زائد شعراء نے آزاد غزلیں لکھی ہیں۔ مظہر امام، علیم صبا نویدی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، افتخار امام صدیقی، حیدر قریشی، ظفر ہاشمی، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر وزیر آغا، زرینہ ثانی اور محمد اقبال نجمی نے آزاد غزل کو پروان چڑھانے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل میں آزاد غزل کیلئے صفحات مختص کئے۔ ماہنامہ ''صریر'' کراچی (مدیر ڈاکٹر فہیم اعظمی) نے تواتر سے آزاد غزلیں شائع کیں اور آزاد غزل کے حوالے سے مظہر امام اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے کئی مضامین شائع کیے اور اپنے قارئین کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ (پیش نظر تعارف میں متذکرہ مضامین سے بھی استفادہ کیا گیا ہے)۔

ظہیر غازی پوری اپنی تجرباتی غزل کو ''غزل نما'' کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر آزاد غزل یوں کہی جائے کہ ارکان کی کمی بیشی کی آزادی تو رہے لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے ارکان برابر ہوں تو یہ ہیئتی تجربہ رواج پا سکے گا۔ ان کی غزل نما کے یہ شعر دیکھئے:

صحن سے گزرو تو آنگن آئے گا
روشنی کا ایک مسکن آئے گا

☆☆☆

قتل احساسات کا الزام مجھ کو دیں مگر
تذکرہ تو آپ کا بھی اختر امن آئے گا

☆☆☆

Marfat.com

فکر کی ہر راہ میں
مقتلِ فن آئے گا

ناوک حمزہ پوری نے ظہیر غازی پوری کی غزل نما کے بارے میں لکھا:

''اس نوع کی غزل کو ''ابیات'' کا عنوان زیادہ زیب دے گا''

فرحت قادری کا خیال ہے:

ظہیر صاحب کی غزل میں چوں کہ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن ہیں۔ اسلئے آزادغزل میں اس کا شمار نہیں ہوسکتا بلکہ اس غزل کے ہر شعر کو کسی نہ کسی پابند غزل کا شعر کہا جا سکتا ہے''

''پاکستان میں آزادغزل'' کے زیرِعنوان ماہنامہ ''صریر'' کراچی، سالنامہ 1993ء کے صفحہ 94-93 پر مظہر امام لکھتے ہیں:

''میں بہت ایمان داری سے محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت برصغیر میں آزادغزل کے سب سے اچھے شاعر قتیل شفائی ہیں۔ دیگر شعراء میں میرا خیال ہے، ماجدالباقری، سجاد مرزا، فرحت نواز اور خاور اعجاز کی آزادغزلیں اس صنف کے مطالبات کو پورا کرتی ہیں۔''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بھاگل پور (بھارت) سے راقم (سجاد مرزا) کے نام اپنے مکتوب (محررہ 15 مئی 1991ء) میں لکھتے ہیں:

''آپ سے مراسلت کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مئی (1991ء) کا ''صریر'' آیا تو یہ بہانہ ہاتھ آ گیا۔ آزادغزل کیلئے شکریہ اور مبارکباد قبول کریں۔

90ء کی ابتدائی تاریخوں میں علامہ ماجدالباقری صاحب کا ایک پیکٹ ملا تھا۔ جس میں آپ کی آزادغزلیں بھی تھیں۔ جس روز یہ پیکٹ ملا تھا، میں ''توازن'' والوں کو بعض تخلیقات بھیج رہا تھا۔ آپ کی آزادغزل اور دوسروں کی دیگر تخلیقات میں نے اسی روز ''توازن'' والوں کو بھیج دی تھیں۔ لیکن ''توازن'' نہیں چھپا۔ اس بیچ میرے ان سے تعلقات خراب ہو گئے

Marfat.com

اور میں اس رسالے سے الگ ہوگیا۔ آپ کی گذشتہ سال کی آزاد ☆ غزلیں اب پڑھی ہیں ماجد الباقری اور آپ وہاں آزاد غزل کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ قتیل شفائی صاحب بھی ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ صنف اتنی "من موہک" ہے کہ بہتوں کے دل و ذہن پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ افسوس ہے کہ پوری اردو دنیا میں اس کے لیے ایک بھی آرگن نہیں ہے۔ آپ کی آزاد غزلیں پسند آئیں۔"

24 اپریل 1996ء کے روزنامہ "جنگ" لاہور کے جریدہ ادب میں جواز جعفری کا ظفر اقبال اور انیس ناگی سے کیا ہوا ایک مشترکہ انٹرویو شائع ہوا ہے۔ آزاد غزل کے حوالے سے ظفر اقبال فرماتے ہیں:

"آزاد غزل کا کوئی جواز ہے اور نہ اس کی ضرورت اور نہ ہی کوئی امکان ہے، کیونکہ آزاد نظم اور نثری ہوتے ہوئے بھی نظم رہ سکتی ہے جبکہ غزل اپنی ہیت کو خیر باد کہتے ہی غیر غزل ہو جاتی ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ بری طرح ناکام ہوا ہے۔"

انیس ناگی کا فتویٰ بھی پڑھ لیجئے۔

"غزل میں تو عشق و محبت اور امرو پرستی کے قصے ہوتے ہیں، غزل کا اگر فرض محال زندگی سے کوئی تعلق ہے تو پھر نثری نظم کا کیوں نہیں؟ آزاد غزل محض ☆ بکواس ہے۔ کافی عرصہ پہلے ہندوستان کے ایک شاعر نے بھی آزاد غزل لکھی تھی جو اپنی موت آپ مر گئی۔"

ظفر اقبال کی شاعری کے حوالے سے مظہر امام "صریر" کے شمارہ جون، جولائی 1993ء صفحہ 93 پر لکھتے ہیں: "پاکستان میں اس نئی صنف (آزاد غزل) سے متاثر ہونے والے پہلے شاعر ظفر اقبال تھے مگر انہوں نے "اینٹی غزل" کہنے کے شوق میں اپنی غزل کو بھی غیر سنجیدہ رنگ بخشا۔ ان کا مقطع تھا۔

نظر ثانی بھی کریں گے اس غزل پر اے ظفر
فی الحال تو لکھی ہے رف

Marfat.com

کاش! اس غزل پر ہی نہیں، ظفر اقبال اپنے شعری موقف پر بھی نظر ثانی کرتے اور پھر اس نئی صنف کی طرف توجہ دیتے تو آزاد غزل کے گیسو سنوارنے میں ان کے شانہء فن کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوتی۔''

جہاں تک ظفر اقبال کا یہ کہنا ہے کہ آزاد غزل کا تجربہ بری طرح ناکام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد غزل کی تخلیقی رفتار قابل توجہ ہے۔ جن لوگوں کا مطالعہ محدود ہے، ان سے شکایت کیسی؟

علیم صبا نویدی کی باسٹھ آزاد غزلوں کا مجموعہ ''ردکفر'' اور ''قید شکن'' کے نام سے آزاد غزلوں کا ایک انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ قتیل شفائی کے مجموعہ ''آموختہ'' میں چھ آزاد غزلیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کرشن موہن کے مجموعے ''کمل کا منا'' میں تین اور ''بانکپن کا احساس'' میں سترہ بدیع الزماں خاور کے مجموعے سات سمندر میں دو، ''موتی پھول ستارے'' میں ایک اور ''سبزہ تازہ نہالوں کے انبوہ میں'' میں چھ۔ احمد وصی کے مجوعہ کلام ''بہتا پانی'' میں ایک، خالد رحیم کے مجموعے ''عکس در عکس'' میں سات، زیب غوری کے ''چاک'' میں ایک، رشی کانت راہی کے مجموعے ''حرف سبب'' میں ایک، اقبال ماہر کے ''لوح ادب'' میں ایک، یوسف جمال کے مجموعے ''سوکھے جزیرے کی دعا'' میں سترہ اور ساحر ہوشیار پوری کے مجموعے ''سحر خیال'' میں ایک آزاد غزل شامل ہے۔

جن اخبارات ورسائل نے آزاد غزل کے لیے اپنے صفحات مختص کیے، ان کا کردار بھی قابل تعریف ہے۔ ''رفتار نو'' در بھنگا، ''توازن'' مالیگاؤں، ''کوہسار'' بھاگل پور، ''گلبن'' احمد آباد، ''جدید ادب'' خان پور، ''دریافت'' کراچی، ''شاعر'' بمبئی، ''پندار'' پٹنہ، ''صریر'' کراچی، ''معلم اردو'' لکھنو، ''لمحہ فکریہ'' دہلی، ''اوراق'' لاہور، ''جام صحت'' گوجرانوالہ اور ''رہگذر'' سیال کوٹ نے آزاد غزلیں اور آزاد غزل کے حوالے سے مضامین بھی بڑی فراخ دلی سے پیش کیے۔

یہاں صرف ماہ نامہ ''صریر'' کراچی کے دسمبر 1990ء سے جنوری 1997ء تک کے شماروں میں آزاد غزل کی رفتار اشاعت کا ایک مختصر جائزہ بے محل نہیں ہوگا۔ اس جائزے کے

Marfat.com

شفاف آئینے میں آزادغزل کے تجربے کو ناکام کہنے والوں، آزادغزل کو بکواس کہنے والوں اور آزاد غزل اپنی موت آپ مرگئی، کہنے والوں کو اپنے چہروں کے خدوخال پہچاننے میں شاید کچھ مدد مل سکے!

حسن امام درد شمارہ دسمبر 1990ء ایک آزادغزل، ڈاکٹر منصور عمر دسمبر 90ء ایک، ستمبر 91ء چار، اکتوبر 92ء تین، جون 96ء دو، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فروری 91ء دو، نومبر 92ء ایک، جون 95ء دو، جون 96ء ایک، سجاد مرزا مئی 91ء ایک، ستمبر 91ء ایک، دسمبر 91ء ایک، فروری 92ء دو، مئی 92ء ایک، جون 92ء ایک، نومبر 92ء ایک، دسمبر 92ء دو، اگست 93ء یکم مئی 93ء دو، نومبر 93ء ایک، مئی 94ء ایک، جون 94ء ایک، اگست 94ء ایک، ستمبر 94ء ایک، نومبر 94ء ایک، جون 95ء ایک، اکتوبر 95ء ایک، ستمبر 95ء ایک، اپریل 96ء ایک، جون 96ء ایک، جنوری 97ء ایک، ڈاکٹر امام اعظم، نومبر 91ء ایک، جون 92ء دو، مئی 94ء ایک، فروری 96ء ایک، رئیس الدین رئیس نومبر 91ء ایک، جون 92ء دو، حیدر قریشی دسمبر 91ء ایک، مظہر امام مئی 93ء ایک، دسمبر 93ء ایک، معبود آمر مئی 93ء ایک، جون 93ء ایک، ظفر ہاشمی ستمبر 93ء ایک، جون 94ء ایک، فروری 96ء ایک، اقبال نجمی ستمبر 93ء ایک، نومبر 94ء ایک، قاضی اعجاز محور فروری 94ء ایک، ماجد الباقری مئی 94ء ایک، اگست 94ء ایک، یوسف جمال مئی 94ء ایک، اگست 94ء ایک، یونس احمر جون 95ء ایک، اظہر نیر جولائی 95ء ایک، ''صریر'' کے مضامین کے حوالے کے طور پر شائع ہونے والی مذکورہ اڑسٹھ (68) آزادغزلوں کے علاوہ بھی متعدد غزلیں ہیں۔

1995ء میں محمد اقبال نجمی نے ''پاکستانی آزادغزل'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کر کے فروغ ادب اکادمی ۸۸۔بی، گوجرانوالہ کے زیراہتمام شائع کیا۔ پاکستان میں آزادغزل کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں چھ شعراء کے مختصر کوائف اور ان کی غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب مظہر امام، ڈاکٹر فہیم اعظمی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام ہے۔ اس مجموعے میں قتیل شفائی

Marfat.com

کی سات، ماجد الباقری کی نو، سجاد مرزا کی اکیس، اقبال نجمی کی تینتیس، قاضی اعجاز محور کی تیرہ اور ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کی گیارہ آزاد غزلیں ہیں۔

1995ء ہی میں فرحت عباس شاہ کا مجموعہ ''محبت گم شدہ میری'' منظر عام پر آیا، جس پر لکھا تو آزاد غزل ہے لیکن یہ غزلیں آزاد غزل کی ''پابندیوں'' پر پورا نہیں اترتیں۔ فرحت عباس شاہ کی محنت سے کہی ہوئی یہ خوبصورت معریٰ غزلیں یا ابیات ہیں۔ وہ اس مجموعے کے ابتدائیے میں اپنا ''نقطہ نظر'' یوں پیش فرماتے ہیں۔

''ہمارے ہاں غزل پر جتنے بھی غیر فطری اور شعوری تجربات ہوئے ہیں، ان میں لسانی توڑ پھوڑ اور ہیئتی اگاڑ پچھاڑ کے بڑے چرچے رہے ہیں اور یار لوگوں نے غزل کے شعر کا ایک مصرعہ چھوٹا کر کے (وغیرہ وغیرہ) سے غزل پر تجربہ قرار دے دیا اور اپنی ہی بدقسمتی سے اسے آزاد غزل کا نام بھی دے دیا حالانکہ غزل بیچاری آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق اور زیادہ پابند اور مقید ہوگئی۔''

''اور پھر ایک دن مجھ پر منکشف ہوا کہ شاید میں غزل کی وہ نئی جہت اور ایک اگلی منزل دریافت کر بیٹھا ہوں جو نہ صرف اپنے اندر غزل کا تمام حسن و جمال بھی لئے ہوئے ہے بلکہ روایتی پابندی سے بھی آزاد ہو چکی ہے۔''

اب فرحت عباس شاہ کی ''آزاد غزل'' ملاحظہ ہو۔

مری دسترس میں تھی زندگی
میں نے تیری راہ پہ ڈال دی
مجھے ہر حسین و جمیل پر
ترے خال و خد کا تھا شائبہ
تجھے ڈھونڈ لائے گا ایک دن
مجھے اعتماد تھا اور ...

Marfat.com

تری جستجو تو ہے جستجو
مرے حوصلے کا سوال ہے
یہی اک دعا ہے کہ اے خدا
مجھے اپنے غم میں شریک کر

یہ انکشافی تجربہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ استاد یوسف ظفر کا مجموعہ ''زہر خند'' 1944ء میں شائع ہوا تو اس میں یہ غزل بھی پڑھنے کو ملی۔

کہو اک بات کہوں کوئی سنے گا تو نہیں
تم سنو گی ! ارے ہاں تم تو سنو گی ، لیکن

☆☆☆

سوچ لو ، سن کے برا تو نہیں مانو گی اسے
تم برا مانو گی میں جانتا ہوں ، جانتا ہوں

☆☆☆

خیر ! لو آؤ ، سنو ، آؤ قریب آجاؤ
کوئی آ جائے گا ! آئے گا تو پھر کیا ہو گا

☆☆☆

پھر سہی پھر سہی ، جاؤ کوئی آ جائے گا !
اب کہوں ؟ سوچ لو میں تم سے کہے دیتا ہوں

☆☆☆

نہیں مانو گی ؟ نہیں مانو گی تم ؟ مان بھی جاؤ
کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو ، ٹھہرو ، ٹھہرو

☆☆☆

Marfat.com

چھیڑتا ہوں؟ تمہیں میں چھیڑتا ہوں! خوب چہ خوب
اچھا ! تو آؤ سنو تم نہیں مانوگی !

☆☆☆

مانوگی؟ اچھا کہے دیتا ہوں میں نے کل رات
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولوں گا

فارغ بخاری کا تجرباتی مجموعہ ''غزل'' 1979ء میں شائع ہوا۔ اس میں اسی انداز کی معریٰ غزلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

''درد کی خوشبو'' 1994ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے صفحہ 23-122 پر ''غزل کہنا نہیں آساں'' کے زیرِ عنوان ہے۔

کسی بے کار کار لمحے میں غزل کہنا نہیں آساں
کہ ڈستی ہیں، مری تنہائیاں شام و سحر مجھ کو

☆☆☆

اپیلوں کے موثر موڑ بھی کروٹ بدلتے ہیں
کئی ان دیکھے اندیشے اٹھا کر سر نکل آئیں !

☆☆☆

تو ایسے میں کسی تخلیق کا انجام کیا ہو گا
میں اکثر سوچ کی لہروں پہ بہتا ہی چلا جاؤں

☆☆☆

مجھے کچھ سوچنا ہے، جب کبھی فرصت میسر ہو
مگر فرصت کے لمحے تو اذیت ناک ہوتے ہیں

☆☆☆

Marfat.com

کئی گمبھیر یادیں ، عہد ماضی سے ہیں وابستہ
امانت کی طرح دل میں جنہیں مدفون رکھتا ہوں

☆☆☆

کسی مستور کو عریاں کروں ، میرا نہیں مسلک
اگر افشا کروں تو زندگانی تلخ ہو جائے

☆☆☆

بس اتنا سوچ کر ہونٹوں کو میں جنبش نہیں دیتا
قلم کو بے ارادہ بھاگنے سے روک لیتا ہوں !

خواجہ رحمت اللہ جری نے بھی معرا غزل کا تجربہ کیا ہے۔ وہ ماہنامہ ''صریر'' کراچی، نومبر 1995ء کے صفحہ 39-38 پر رقم طراز ہیں:

''معرا غزل لکھنے کا خیال مجھے اس لئے آیا کہ ردیف اور قافیے کی بندش کو توڑ کر کسی خیال کی طبعی روانی کو برقرار رکھتے ہوئے، اس طرح شعر کہا جائے کہ انفرادی طور پر وہ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ہر شعر کسی مروجہ بحر میں ہو اور ہر مصرع کے ارکان پابند غزل کی طرح برابر ہوں۔ ہر شعر فنی لوازمات سے نہ صرف آراستہ ہو بلکہ اس کی ادائیگی میں ردیف قافیے کی پابندی حائل نہ ہو، تاکہ جو شعر وارد ہو، وہ کسی تصنع سے مبرا ہو۔ ردیف / قافیے سے آزادی حاصل کر کے شاعر اپنی شعری صلاحیتیں روانی، بے ساختگی، جدت، بلند خیالی، سادگی، نغمگی وغیرہ وغیرہ کو بھرپور طریقے سے استعمال کر سکے۔ معرا اور آزاد نظم کی موجودگی میں معرا غزل کا لکھنا ایک تجربہ سہی، لیکن اس میں حسن غزل کو مجروح نہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے''

خواجہ رحمت اللہ جری کی معرا غزل کا نمونہ یہ ہے۔

کب کے غائب ہوئے ہیں دہشت گرد
اب لکیروں کو پیٹتے رہیے

Marfat.com

یہ فقط کاغذی کھلونے ہیں
شمع کوئی یہاں نہ پروانہ

☆☆☆

کیسے مالک ہوں غیر لوگوں کے
اپنی مرضی کے ہم نہیں مالک

☆☆☆

اس کے چڑھنے کو کس نے دیکھا ہے
چڑھتے سورج کو پوجتے ہیں سب

☆☆☆

چاہے دیوار کتنی اونچی ہو
غنچہ چٹکے تو باس پھیلے گی

☆☆☆

کچھ جلاؤ کہ روشنی تو ملے
ہم اندھیروں میں رہ نہیں سکتے

☆☆☆

کون پیچھے دکھوں کا ہو وارث
اتنی مہلت کہاں وصیت کی

☆☆☆

میں مسائل میں ہوں گھرا ایسے
جیسے آنچل ہوا کی ٹھوکر میں

☆☆☆

Marfat.com

خوش نصیبی تو جا چکی کب کی
کو سے رہیے اپنی مرضی کو

محولا بالا نمونہ جات کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک آزادغزل کہنا، پابند غزل کہنے سے مشکل ہے اور اس مشکل سے عہدہ برآمد ہونا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ یہ الگ بات کہ مشہور و معروف شعراء ادبی اخباروں کو انٹرویو دیتے ہوئے آزاد غزل کہنے والوں کو برا بھلا کہتے رہیں، کیوں کہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ خود آزاد غزل کہہ نہیں سکتے!

☆☆☆☆☆

Marfat.com

کارکن تحریک پاکستان

خلیفہ امام الدین بقا جالندھری

خلیفہ امام الدین بقا نے کسی مال دار گھرانے یا سیاسی لحاظ سے مستحکم خانوادے میں آنکھ نہیں کھولی کہ ہوش سنبھالتے ہی دنیاوی شہرت و ناموری ان کی خاکِ پا میں اپنا مقدر ڈھونڈنے لگتی بلکہ انہوں نے ایسے گھرانے میں جنم لیا جو مالی و معاشی لحاظ سے تو سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھا لیکن اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے معزز سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ صاحب نے ایک معمولی کارکن کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور پیشہ ور لیڈروں اور خاندانی سیاست دانوں کو باور کرادیا کہ عظمت و ناموری کسی کی میراث نہیں بلکہ جو بھی جرات و صداقت کا پرچم لہرا کر آگے بڑھے گا، عظمت اس کا مقدر بنتی چلی جائے گی۔

پاکستان کے سیاسی حلقے اور گوجرانوالہ کا بچہ بچہ خلیفہ امام الدین بقا کی عظمت کردار کے گن گاتا ہے۔ اگر وہ چاہتے تو سیاسی زندگی میں انہیں کئی مواقع ایسے میسر آئے کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کیلئے لاکھوں روپے کا ترکہ چھوڑ سکتے تھے۔ حیف صد حیف کہ وہ عمر بھر پیسے پیسے کے محتاج ہے۔ انہوں نے اپنی اقتصادی بدحالی دور کرنے کے لئے سیاسی سودے بازی نہیں کی بلکہ ایک غریب کارکن رہ کر بھی بڑے بڑے جاگیرداروں، برخود قسم کے سیاست دانوں، فرعون مزاج آمروں، شعبدہ بازوں اور ڈکٹیٹروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا مافی الضمیر اور نقطہ نظر پیش کیا اور اکثر حق گوئی و بیباکی کے سہارے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ اگر پاکستان کی سیاسی تاریخ ایمانداری اور نیک نیتی سے مبنی بر حقائق مرتب ہوئی تو کارکنوں کے زمرے میں خلیفہ امام الدین بقا کا نام سرفہرست ہوگا۔

Marfat.com

میاں محمد شفیع (م۔ش) نے خلیفہ صاحب کے بارے میں لکھا تھا۔

''خلیفہ امام الدین بقا، اللہ نہیں صحت والی لمبی عمر عطا فرمائے تحریک پاکستان کے السابقون الاولون میں شامل تھے۔ جالندھر میں تین نوجوان جناب میاں شمس الدین مرحوم و مغفور، جناب عبدالمجید سچ اور جناب خلیفہ امام الدین بقا تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ان تینوں نوجوانوں نے اپنے آپ کو مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ تینوں بڑے سلجھے ہوئے سنجیدہ طبع اور مستقل مزاج نوجوان تھے۔ میں جب بھی لاہور سے جالندھر جاتا، ان تینوں سے ضرور مل کر آتا۔ خلیفہ امام الدین بقا نے تقسیم کے پرآشوب ایام میں جالندھر کے لوگوں کو قافلوں کی شکل میں منظم کر کے پاکستان بھیجنے کے لیے آخری دن تک کام کیا۔ بارش ہو یا طوفان، آگ برس رہی ہو یا مہاسبھائی غنڈوں کی یورش، جناب بقا صاحب ہمیشہ بے کس لوگوں کی حمایت میں سینہ سپر نظر آتے تھے۔ میرے خیال میں وہ سب سے آخر میں جالندھر کو چھوڑ کر، پاکستان کی طرف آنے والے مہاجر ہیں۔

خلیفہ امام الدین بقا کے بوٹوں کی گرد کو آنکھوں سے صاف کرنا بھی عزت و افتخار کا باعث ہے۔ میں نے ہمیشہ انہیں سلام کیا ہے اور اب بھی انہیں سلام کرتا ہوں۔ کاش کہ قیام پاکستان کے بعد انہیں پنجاب میں مہاجرین کی آبادکاری پر لگا دیا جاتا تو آج پنجاب کی شکل ہی کچھ اور ہوتی''

سابق وزیراعظم پاکستان سید حسین شہید سہروردی مرحوم گوجرانوالہ آئے تو صاحب ثروت میزبانوں کو چھوڑ کر اسی درویش خدامست خلیفہ امام الدین بقا کے غریب خانے ہی پر قیام کیا۔ اس موقع پر سہروردی مرحوم نے جو پاکستان کے اس فدائی کی خدمات سے بخوبی آگاہ تھے، خلیفہ صاحب کو پیش کش کی کہ یہ جو بھی طلب کریں، انہیں مل جائے گا۔ خلیفہ صاحب نے یہ کہتے ہوئے ان مراعات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

''میں نے پاکستان کے قیام کے لیے تمام تر جدوجہد فقط اس لئے کی تھی کہ برصغیر کے

Marfat.com

مسلمانوں کو ایک دارالامان میسر آجائے اور اب بھی اگر میں خدمت وطن کے لیے کوشاں ہوں تو اس لیے کہ پاکستان پوری دنیا کے مسلمانوں کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ میری یہ خدمت کسی پر بھی احسان نہیں بلکہ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ لہذا میں مراعات کیسے قبول کرسکتا ہوں؟''

اپنے ایک انٹرویو میں جو پندرہ روزہ ''آتش فشاں'' لاہور میں 4 دسمبر 1976ء کو شائع ہوا، بتایا تھا۔

''قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو آخری الوداعی دعوت دی۔ ہم گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو جو ٹیبل ہمیں ملی، وہ گیٹ کے قریب تھی۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ پہلی میز تھی۔ مقررہ وقت پر قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح تشریف لائے۔ انہوں نے کونسلروں سے گھل مل کر باتیں کرنے کا آغاز ہماری میز سے کیا۔ اس عظیم انسان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔ ''آپ نے بڑی خدمت کی ہے'' میں نے عرض کی حضور! ہم تو آپ کے ادنیٰ سپاہی کے طور پر آج بھی صف بستہ ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، دس کروڑ مسلمانوں کو آپ کی بہت ضرورت ہے''۔ جواب میں، انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے مجھ پر عنایت کی۔''

خلیفہ امام الدین بقا جیسی نادر روزگار شخصیتیں کبھی کبھار پیدا ہوتی ہیں جو زندگی بھر ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتی ہیں اور کبھی اصولوں کی خاطر سرنگوں نہیں ہوتیں۔ اگر وہ کسی اور ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو لوگ ان کے بت بنا کر پوجتے مگر یہاں کوئی پرسان حال نہیں۔ آیئے اس درخشندہ شخصیت کی جھلک کاروانِ وقت کے ساتھ ساتھ اجمالاً دیکھتے چلیں۔

- یکم جنوری 1893ء میں خلیفہ امام الدین بقا جالندھر شہر میں پیدا ہوئے۔
- 1919ء تا 1929ء مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں نائب ڈکٹیٹر (سالار) کی حیثیت سے کام کیا۔
- 1930ء میں تحریک کشمیر میں شامل رہے اور امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری کی صحبتوں سے فیض اٹھایا۔

Marfat.com

- 1931ء میں مولانا ظفر علی خان کی تنظیم ''اتحاد ملت'' میں شامل ہوئے۔ مولانا کی حوصلہ افزائی سے ادبی کام شروع کیا۔
- 1932ء میں علامہ اقبال کی ہدایت پر مسلم لیگ میں شامل ہوئے بعد میں جالندھر کے ضلعی جنرل سیکرٹری بنے۔
- 1935ء آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر چنے گئے۔
- 1940ء میں قرارداد پاکستان کے موقع پر اپنے چار سو ساتھیوں سمیت لاہور آئے
- 1941ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ''آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کا اجلاس قائداعظم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خلیفہ صاحب اس میں متعدد ساتھیوں سمیت شریک ہوئے۔
- 1942ء میں خلیفہ صاحب کی کوششوں سے جالندھر شہر میں قائداعظم کی زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔
- 1942ء میں جالندھر کے جلسہ کے چھ ماہ بعد الہ آباد میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا اجلاس قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ خلیفہ صاحب نے اجلاس میں شرکت کی۔
- 1943ء میں مسٹر عبداللہ ہارون کی زیر صدارت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ خلیفہ صاحب بہت سے ساتھیوں سمیت اجلاس میں شریک ہوئے۔
- 1944ء میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ قائداعظم نے صدارت فرمائی۔ خلیفہ صاحب نے اس میں بھی شمولیت کی۔
- 1945ء میں علی گڑھ کالج میں طلبا کے انتخابات کروانے اور وہاں کے

Marfat.com

سنگین حالات پر قابو پانے کیلئے قائداعظم نے راجہ صاحب محمود آباد اور خلیفہ امام الدین بقا کی ڈیوٹی لگائی۔

- 1947ء میں چھ لاکھ مہاجرین کو پاکستان پہنچانے کا انتظام خلیفہ صاحب نے کیا اور خود چھ ماہ بعد سرزمین پاکستان پر قدم رکھا۔
- 1948ء میں خالق دینا ہال کراچی میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' اور ''پاکستان مسلم لیگ'' کے تمام عہدے داروں کا اجلاس ہوا۔ خلیفہ صاحب اس میں بھی شریک ہوئے۔
- 1949ء تا 1964ء میں حسین شہید سہروردی کی ''عوامی لیگ'' میں شامل رہے۔ گوجرانوالہ میں سب سے پہلے عوامی لیگ کے صدر اور مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔
- 1964ء میں ''پی۔ڈی۔ایم'' میں شامل ہوئے اور جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ محترمہ فاطمہ جناح کے الیکشن میں بھرپور مدد کی۔
- 1966ء میں ''جمہوری پارٹی'' میں شامل ہوئے لیکن بہت جلد علیحدہ ہو گئے۔
- 1970ء تا 1980ء ''تحریک استقلال'' میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد تا دمِ مرگ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش رہے۔
- 14 جون 1995ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ (ایک سو دو سال کی عمر میں ان کی وفات سے اڑھائی ماہ پیشتر 31 مارچ 1995ء کو ''سفینہ

ادب'' گوجرانوالہ نے انہیں ایوارڈ دیا اور مشاعرہ منعقد کیا۔ مشاعرے میں گوجرانوالہ شہر اور مضافات کے پچاس سے زائد شعراء نے شرکت کی۔ خلیفہ صاحب نے اس مشاعرے میں جو غزل سنائی۔ وہ ان کے حسب حال تھی اور ان کی یادداشت پر سامعین حیران تھے اور ان کے شعر

Marfat.com

بار بار سنے گئے، جن پر خوب داد دی گئی۔ چند شعر دیکھئے۔

غم حیات نے کچھ اس طرح جلائے ہیں
چراغ سحری سر بزم بن کے آئے ہیں

☆☆☆

ہمارے دم سے چھٹی تیرگی زمانے کی
وفا کی راہ میں ہم نے دیے جلائے ہیں

☆☆☆

ہمارے دل کی لگی، آنسوؤں سے بجھ نہ سکی
ہم اپنی آہوں میں جل جل کے مسکرائے ہیں

☆☆☆

بقا کے بعد زمانہ وفا کو ترسے گا
بساط دہر پہ ہم دوست ڈھلتے سائے ہیں

تین شعر اور ملاحظہ ہوں۔

انقلاب دہر ہے وہ بھی سماں دیکھا کئے
جب ہمیں اہل وطن بے خانماں دیکھا کئے

☆☆☆

جو ہوا ہم پر ستم اے باغباں دیکھا کئے
موسمِ گل میں اجڑتا آشیاں دیکھا کئے

☆☆☆

دیکھتی تھی ہم کو دنیا، ہم تمہیں تھے دیکھتے
تم خدا جانے کدھر اے مہرباں دیکھا کئے

Marfat.com

گوجرانوالہ کی ادبی اور سیاسی تاریخ بڑی درخشندہ ہے۔لیکن اسی شہر میں خلیفہ امام الدین بقا جیسی بوقلموں شخصیت نے بے سروسامانی کے عالم میں زندگی کے دن پورے کیے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی وہ شخصیت جسے سبھی مخلص کہتے تھے مخلص ہی نہیں مفلس بھی تھی۔ جس نے زندگی کے کسی موڑ پر خودداری کے آبگینوں کو چکنا چور نہیں ہونے دیا، جو سیاسی کارکن سے ممتاز راہنما اس لئے نہ بن سکا کہ اس کی جیبیں خالی تھیں۔اس نے قومی سرفرازی کیلئے اپنا خون جگر پیا مگر مجبور و مقہور انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ یہ مایہ ناز ہستی وہ چراغ سحری تھی جس نے اپنی ٹمٹماتی لو سے تاریک راہوں کو منور کیا۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

غالب کا ایک شعر

شعر جتنا ہی سادہ اور بے ساختہ ہوگا اتنا ہی صداقت سے معمور ہوگا اور اسی نسبت سے دل نشین ہوگا۔ لیکن انسانی نفس اور انسانی زندگی کے حقائق اور مسائل تہذیب وتمدن کے ارتقا کے ساتھ پیچیدہ، گہرے اور تہہ در تہہ ہوتے گئے ہیں۔ جن کو قابل فہم بنانے کیلیے شاعر کو تشبیہات و استعارات اور دوسرے صنائع بدائع سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان ذرائع کے استعمال کا اصل مقصد یہ ہے کہ مادی اور فکری، خارجی اور باطنی حقائق کو زیادہ سہولت کے ساتھ سمجھایا جا سکے۔ جہاں تشبیہات اور استعارات کو مقصود بالذات سمجھ لیا گیا وہیں سے تخیل کی بے راہ روی شروع ہو جاتی ہے اور شعر لفظوں کی کاری گری ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں کوئی روح باقی نہیں رہتی۔

غالب کے ہاں تفکر کی انتہا، بے پناہ طباعی، خلاقی اور جدت طرازی ہے۔ غالب نے فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی الگ راہ پیدا کی اور بیان کے نئے نئے زاویے تلاش کئے غالب کے ہاں تصوف وحکمت بھی ہے، پند ونصائح بھی اور عاشقانہ رنگ بھی، لیکن ہر رنگ میں اس کی شوخی و بے باکی بلندی تخیل کارفرما ہے اور معنوی نزاکتوں کے جو مرقعے غالب نے سجائے ہیں، ان کی مثال ملنا محال ہے۔

تشبیہات واستعارات سے ایک اچھے شعر کی تخلیق میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان سے معنی آفرینی اور اظہار خیال میں اختصار وایجاز کی ایسی طاقت ہاتھ آتی ہے جس کی وجہ سے مشکل سے مشکل خیال، کم سے کم الفاظ میں ادا ہو جاتا ہے۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

Marfat.com

''غالب کے قصرِ شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے۔ اس جدت طرازی میں جدت تخیل، جدت طرز ادا، جدت استعارات، جدت محاکات اور جدت الفاظ، سب آ جاتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ نئے خیالات کم ہوتے ہیں، یا تو پچھلے خیالات میں اضافہ کر کے داد ایجاد دی جاتی ہے یا خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پیش کیا جاتا ہے یا دو خیالات کی ترتیب و امتزاج سے ایک نیا پیکر پیدا کیا جاتا ہے۔ غالب نے یہ سب کیا ہے''

ہر غزل گو نے اپنے ذوق اور اپنے رنگ سے غزل کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ ولی نے غزل کو سادگی اور بے ساختگی بخشی، میر نے دل کا سوز بخشا، درد نے صوفیانہ لب و لہجہ دیا۔ مومن نے انداز کی شوخی عطا کی۔ داغ نے چنچل پن اور حالی نے متانت سے غزل کو سنوارا۔ غالب نے خیال کی بلندی اور انداز کے حسن سے غزل کو تیر نیم کش بنا دیا۔ انہوں نے اپنے جذبے کے خلوص سے غزل میں نکھار ہی نہیں وقار بھی پیدا کیا۔ انہوں نے تغزل اور تفکر کا ایک حسین امتزاج پیش کیا۔

غالب کی شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ جس میں جدت طرازی، بلند پروازی، مرصع کاری، تفکر، تنوع، رفعت حوصلہ، خودداری، حسن بیان اور معراج تخیل کے ساتھ ساتھ شوخی، طنز، مزاح، ظرافت، بانک پن اور انداز بیاں میں ایک نیا پن ہے۔ ان کے کلام میں یہ گہرائی کیسے نمو پذیر ہوئی؟ یہ وسعت خیال و نظر کیوں کر معرض وجود میں آئی؟ ناقدین و شارحین آج بھی سوچ سمندر میں غوطہ زن ہیں۔

کلام غالب کی بڑی خصوصیت یعنی مشکل گوئی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اب تک دیوان غالب کی متعدد مکمل اور نامکمل شرحیں معرض وجود میں آ چکی ہیں اور اردو ادب میں یہ فخر حرف غالب ہی کو حاصل ہے مگر باوجود اس قدر توجہ کے اب بھی بہت سے اشعار تشریح کے محتاج ہیں۔

غالب کے کلام میں اتنی گہرائی اور گیرائی موجود ہے کہ ہر شخص اپنے طور پر اس میں سے معنی اخذ نہیں کر سکتا۔ غالب کا ایک اہم رویہ اور عنصر جو اس کی شاعری کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ غالب اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے وسعت اور بلندی کی تلاش میں رہتا

Marfat.com

ہے اور جہان نو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ غالب چونکہ فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا بڑا مشکل پسند انسان تھا۔ اس لیے بیان کے نئے زاویے تلاش کرنے کے لیے اس کا خیال ہمیشہ دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گرہ ضرور لگاتا ہے۔

غالب کا جو شعر میرے پیش نظر ہے، اس کی گہرائی میں اترنے کیلئے میں نے بہت سی شرحیں دیکھی ہیں۔ لیکن عقدہ وا نہیں ہوا۔

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

''مشکلات غالب'' میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ وجود میں خواہ مخواہ فکر و قیاس سے کام لینا بیکار ہے۔ کیونکہ اس باب میں تیرا ہر تصور نشیب و فراز اور ناہمواری سے خالی نہیں اور تو اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتا''

مولانا عبدالباری آسی بہت دور کی کوڑی لائے ہیں:

1۔ صوفیاء وغیرہ پر طنز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنے وہم میں وحدت وجود یعنی توحید و عرفان کا راستہ طے کرنا چاہتا ہے اور اس میں تو نے مراتب مقرر کیے ہیں کہ پہلے فنافی الشیخ ہو، پھر فنافی الرسول، پھر فنافی اللہ اور دیگر مقامات جبروت، ملکوت اور ناسوت وغیرہ کو طے کرے۔ تو ان نشیب و فراز اور مقالات کا خیال تیرے دل میں ہے اور تو ان خیالات میں محو ہے، تو اس راستے کا طے کرنا ایک فضول ورد بے ہودہ کام ہے۔ اس صورت سے تو ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

2۔ تُو نے ماسوا اللہ کا کچھ وجود سمجھ رکھا ہے۔ اسی وہم کے جنگل کو تیرا وجود طے کر رہا ہے اور باوجود اس کے سینکڑوں انقلابات تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے مگر پھر بھی تیری نظر میں نشیب و فراز کی وقعت ہے۔ حالانکہ وجود ماسوا اللہ اور نشیب و فراز کچھ چیز نہیں اور یہ تیرا وہم ہی وہم ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے بڑی سادگی سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

Marfat.com

''تیرے تصور میں نشیب وفراز ہیں یعنی تیرا تصور ناتمام اور قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت الوجود کا عقیدہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ وجود اشیائے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو''

بیخود دہلوی کہتے ہیں۔

''وجود ماسوا اللہ میں تو بے کار ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا ہے؟ معلوم ہوا ابھی تیرے تصور میں نشیب وفراز ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ابھی تک تیرا تصور ناتمام اور ناقص ہے''

شعر مذکور میں مشکل الفاظ کی جو توضیح ملتی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

بہ ہرزہ: بے ہودہ، فضول، بیکار، بے فائدہ۔

بیاباں نورد: جنگل طے کرنے والا

وجود: ماسوا اللہ کا وجود۔ خدا کے سوا دنیا کی تمام چیزیں۔

نظم طباطبائی لکھتے ہیں:

''وجود سے وجود ماسوا اللہ مراد ہے اور نشیب وفراز کا یہی سبب ہے کہ تو وجود کیلئے مراتب سمجھے ہوئے ہے۔ جس کا مرتبہ اعلیٰ وجوب ہے اور مرتبہ ادنیٰ امکان ہے اور امکان میں بھی قیام بذاتہ وقیام بغیرہ جو ہر وعرض کیلئے وجود میں پستی وبلندی رکھتا ہے۔ یعنی جادۂ مستقیم یہ ہے کہ ہر شے کو موجود بہ وجود واحد سمجھ اور وجود کیلئے اقسام نہ نکال کہ یہ راستہ بھیڑ کا ہے''

سعید، مہدی اور نشتہ وغیرہ نے اپنی شرحوں میں قریباً مذکورہ باتوں ہی کو دہرایا ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر نے ''نوائے سروش'' میں بات کچھ یوں واضح کی ہے:

''تجھے وجود کے سلسلے میں وہم وگمان کی خاک نہ چھاننی چاہیے جس سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ اگر تو ایسا کرنا چاہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے تصور میں ابھی تک اونچ نیچ باقی ہے۔

وجود کے سلسلے میں اوہام کا شکار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ خود وجود کے مراتب مسلم مانے جائیں، یعنی اس کا سب سے اونچا مرتبہ وجوب کا ہے اور سب سے نچلا امکان کا، یہی اونچ نیچ ہے اور ظاہر ہے جس راستے میں اونچ نیچ ہو وہ مسافر کیلئے پریشانی اور مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔

Marfat.com

رہرو چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

دوسری صورت یہ ہے کہ خود وجود حقیقی کے سوا کسی دوسرے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک یہ بھی وہم وگمان ہی کے بیابان کی خاک چھاننا ہے اسے بھی اونچ نیچ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ انسان کی طبعیت افراط وتفریط سے پاک ہوکر اعتدال وتوانائی پر آجائے تو اس قسم کے اوہام کاملاً ختم ہو جائیں گے، جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور صرف وہم کی تخلیق ہیں اسی طرح نشیب وفراز ختم ہوگا اور یہی فطری اعتدال وتوازن کی روشن دلیل ہے" اور شاید حقیقت بھی یہی ہے جسے مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے باطن میں بھانپ کر سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے تاہم تشنگی ہنوز برقرار ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

روایت شناس شاعر

عزیز لودھیانوی روایت شناس کارواں کے وہ راہ نوردشوق ہیں، جنہوں نے کسی بھی رنگ میں ''جدیدیت'' کی تہمت اپنے سر نہیں لی! انہوں نے شاعری کے مروج سانچوں سے بال برابر بھی انحراف نہیں کیا۔ اس لئے وہ واشگاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں۔

نابود نہ ہو جائے بزرگوں کی امانت
سینے سے لگایا ہے روایات کہن کو

اور اس اعتراف حقیقت سے وہ کسی طرح کی ندامت محسوس نہیں کرتے۔

ہمیں تو بھایا ہے یارو قدیم رنگِ سخن
''جدیدیت'' سے گریزاں ہے زندگی اپنی

''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے'' کے زریں اصول پر وہ پنتالیس سال سے بڑی استقامت اور الوالعزمی کے ساتھ وادی شعر میں محو سفر ہیں۔ ان کے خیال میں جس شاعری نے روایت سے پہلو تہی کر کے چلنے کی کوشش کی اسے دوام حاصل نہ ہو سکا۔ آج اور آج سے پہلے بھی وہی شاعری کامیاب و کامران رہی، جس کی جڑیں روایت کی زمین میں پیوست ہیں۔

عزیز لودھیانوی کو ''ترقی پسندوں'' نے اپنی ڈگر پر چلانے کی متعدد بار کوششیں کیں، لیکن وہ ان کے ہتھے نہیں چڑھے اور اپنے ایمان کی سلامتی کو خطرے کے نشان سے ہمیشہ دور رکھا!

وہ اس بات کے شاکی ہیں کہ ''جدیدیوں'' نے غزل سے حسن تغزل کا زیور اتار کر اسے سراپا برہنہ کر کے کھڑا کر دیا ہے! اور غزل کی بارگاہ حسن و جمال میں نئی لفظیات کے ایسے اصنام تراش کر ایستادہ کر دیئے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے شعرا اگر نیا جنم لے کر اس دنیا میں آ جائیں اور ان

Marfat.com

اصنام کو دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیں اور دوبارہ اپنے اپنے مدفنوں میں جا چھپیں!

عزیز لودھیانوی نے روایت سے یک قلم بغاوت اختیار نہیں کی، وگرنہ وہ زمین ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی، جس پر ان کا راہوارِ فکر گامزن ہے۔ ذاتی سوچ، انفرادی فکر، اپنی شخصیت اور اپنے روایتی اسلوب کی نمائندگی ان کے ہر ہر مصرع سے جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

کون کہتا ہے حدیثِ گل رخاں کہتا ہوں میں؟
ہمنواؤ! اپنے دل کی داستاں کہتا ہوں میں
شاعری تو اک ذریعہ ہے مرے اظہار کا
ورنہ دل کی واردات ناگہاں کہتا ہوں میں

واردات ناگہاں بیان کرنے والے شاعر کی گذرگاہ خیال پر، حیات و کائنات کے حسن گریزاں کی بے قرار بجلیاں اور لپکتے شعلوں کی نیرنگیاں، جلوۂ صد رنگ، قوسِ قزح کی صورت میں بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔

تو نے اس سمت اٹھایا رخ انور سے نقاب
روشنی میرے درو بام تک آ پہنچی ہے

عزیز لودھیانوی کلاسیک انداز کے وہ شاعر خوش نوا ہیں جو لمحہ لمحہ گہرائیوں میں اترتے، فکر و احساس کی ریاضت کرتے، اپنے تشخص کے جلال و جمال کی رفعتوں کو اجالتے چلے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں کو نور مل جائے
میرے دل کو سرور مل جائے
ایک مدت سے ہے تلاش مجھے
زندگی کا شعور مل جائے

وہ زندگی کے شعور کی تلاش میں، زندگی کی ہمہ رنگ کیفیتوں کو شاعری کے دل فریب، موضوعات اور اسالیب کے سانچوں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔

Marfat.com

شاعر کی کارگاہِ فکر میں خیالوں اور خوابوں کی قندیلیں ہر آن فروزاں رہتی ہیں۔اس کی دور بیں نگاہ جس پیکر پر پڑتی ہے،اسے پیکر جمال بنا دیتی ہے۔جس بیگانہ حیات پر اپنی چھوٹ ڈالتی ہے،اسے شعور حیات و کائنات کا ادارک عطا کر دیتی ہے۔جس بلبل لب بستہ سے مخاطب ہوتی ہے اسے بلبل ہزار داستان بنا دینا اس کے لئے کار طفلاں ہے۔

عزیز لودھیانوی کی شاعری کا مستقبل گہرے سناٹوں میں ڈوب جانے والا ہر گز نہیں بلکہ آنے والے دور کا نقیب ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں روایتی فکر و اسلوب سے انحراف کا کم کم تجربہ کیا ہے۔تاریخ یا ماضی کی باتیں بالعموم دھرائی جاتی ہیں اور یہ اعادہ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ فکر سخن میں عزیز لودھیانوی کی ریاضت کا اعتراف نہ کرنا،عصر حاضر کے نقادوں کی بخیلی اور کج نگہی ہے نہ جانے کتنی شبوں کا آرام تج کر،کتنے خوابوں کا نذرانہ دے کر اور کس قدر خون جگر کی بھینٹ دے کر،ایک شاعر،ایک ادیب،ایک فنکار،ایک مصور اپنے شاہکار کو منصۂ شہود پر لاتا ہے۔

ذرا چہرے سے زلفوں کو ہٹالو
یہ گرد شمع کیسی تیرگی ہے؟

اور یہ بھی حقیقت ہے۔

پایا نہ محبت میں کسی دل نے سکوں
افسوس ادھوری۔ یہ کہانی دیکھی!

عزیز لودھیانوی درویش صفت انسان ہیں وہ صوفی وقت کی خام کاری اور اس کے ذوق کے کورانہ پن پر نثار ہو ہو جاتے ہیں۔اس کے ظاہر و باطن کی جھیل کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔تقابل و تفاوت کے سنگریزے ہاتھوں میں لے کر سطح آب پر ابھرتے ہیں اور جب سطح ساکن ہو جاتی ہے تو اس آئینے میں صوفی وقت کو اس کی صورت دکھا کر بڑے دبنگ لہجے میں پکار اٹھتے ہیں۔

تو تو مومن ہے مگر دل نہیں مومن تیرا

☆☆☆

Marfat.com

رنگ، خوشبو، روشنی کا شاعر

اختر ہوشیار پوری

اختر ہوشیار پوری کی شعری کائنات کو رنگ، پھول اور روشنی کے دل کش اور حسین استعاروں نے سجا رکھا ہے۔ ''شہرحرف'' کے ہر صفحے پر ان تینوں استعاروں کا ارادی یا غیر ارادی طور پر اتنے خوبصورت انداز میں استعمال ہوا ہے کہ اختر ہوشیار پوری کو، رنگ، خوشبو اور روشنی کا شاعر کہنے کو جی چاہتا ہے۔ انہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں کہ انہوں نے کس طرح متنوع صورتوں میں روشنی، رنگ، پھول اور خوشبو کے عام فہم الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

ہمیں چراغ ، ہمیں لو ، ہمیں ہیں پروانے
یہ اور بات کہ محفل ہمیں نہ پہچانے

☆☆☆

یہی نہیں کہ سواد چمن ہے رنگ تمام !
دلوں کے پاس بھی آباد ہیں پری خانے

☆☆☆

روشنی اور ہوا ہی نہیں آیا کرتی
روزن در میں فسانے بھی ہوا کرتے ہیں

☆☆☆

Marfat.com

میں تھا خود اپنی روشنی فکر کا قتیل
سورج نے مجھ کو اور ابھر کر جلا دیا

پھول کے حوالے سے اب چند شعر دیکھئے۔

پھول کھلتے جاتے ہیں، کانٹے بچھتے جاتے ہیں
کیا خبر کسے اب کے وقت سازگار آئے

☆☆☆

اپنے بدن کی باس تھی بوئے چمن نہ تھی!
کیا کیا گماں نہ رات کو اک پھول پر ہوا

☆☆☆

یوں جسم مہکتا ہے ہوائے گل تر سے
جیسے کوئی پہلو سے ابھی اٹھ کے گیا ہو

☆☆☆

اس لب و رخ کی بات اے اختر
پھول پر شعلے کا گماں ہو جیسے

خوشبو میں بسے شعر ملاحظہ کیجئے

کہاں کہاں نہ امیدوں کا قافلہ گزرا!
زمیں سے تا بہ فلک رنگ و بو کا چرچا ہے

☆☆☆

دنیا کو خبر کیا ہے مرے ذوق نظر کی
تم میرے لئے رنگ ہو، خوشبو ہو، ضیا ہو

☆☆☆

Marfat.com

بوئے گل لوٹ کر نہیں آئی
کن بہاروں کے رازداں تھے پھول

☆☆☆

کیا کیا نہ قافلوں کی ہے خوشبو بسی ہوئی
لے جائیں گرد راہ کو اختر اٹھا کے ہم

اختر ہوشیار پوری نے رنگ، خوشبو اور روشنی کے حسین امتزاج سے تازہ کاری کی ایک نئی فضا پیدا کی ہے۔ ان کی یہ نئی شعری فضا معنویت کے ادارک کے کیسے دریچے کھولتی ہے اور امکانات کے نادیدہ جہانوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے۔ یہ سب فن کے جدید اظہار اور اسلوب سے گہری وابستگی سے ممکن ہوا ہے۔

کوئی ٹھہرا نہ بہاروں کے برابر اب کے
جل بجھے اپنے ہی شعلوں میں گل تراب کے

☆☆☆

اسے چھولوں تو ہے پتھر، اسے دیکھوں تو ہے پھول
میری نظروں میں ہے اک شخص کا پیکر اب کے

اختر ہوشیار پوری کے جدت پسند شاعرانہ مزاج نے روایت کے تخلیقی شعور سے کہیں بھی بے گانگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ روایت میں گندھے ہوئے الفاظ کو معنویت کے نئے تناظر میں برتنے کے ہنر سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

غرور عہد وفا استوار ہم نے کیا
ہر ایک عکس کو تصویر یار ہم نے کیا

☆☆☆

Marfat.com

وہ آسماں تھا، اس کو زمیں سے کیا نسبت
اسے شریک غم روزگار ہم نے کیا !

☆☆☆

جس روشنی کے دل میں اترنے کی ہے لگن
اس روشنی کے گرد اندھیرے کا جال ہے

اختر ہوشیار پوری نے غزل کی فنی روایت کی صداقت میں ملمع کاری نہیں کی بلکہ حصار ذات سے باہر نکل کر تخلیقی تجربات کی صورت میں حسن آفرینی اور اسلوبیاتی سطح پر ایسی جوت جگائی ہے جو دل کو سرور اور آنکھیں کو نور عطا کرتی ہے۔

نظریں اٹھا کے دیکھ ستارے کہاں نہیں ؟
او مجھ سے ، میرے دیدۂ پرنم سے بے خبر

☆☆☆

اے رہروان شہر بہاراں چلے چلو
زنجیر پا کی شورش پیہم سے بے خبر

☆☆☆

بچھڑے کچھ اس طرح رہ ہستی میں ہم قدم
ہم ان سے بے خبر ہوئے وہ ہم سے بے خبر

☆☆☆

مجھ کو تمہارا درد تھا ، تم کو تھا کس کا درد
تم کیوں میری طرح ہوئے عالم سے بے خبر

☆☆☆

Marfat.com

اختر ہم ان کے ساتھ چمن در چمن رہے
پھولوں کی آنچ خنکی شبنم سے بے خبر

اختر ہوشیار پوری کی شاعری نے زندہ روایت کی پاسداری کا احساس دلایا ہے۔ان کی شاعری میں جرات فکر کی نمو قدم قدم پر دامن دل کھینچ کھینچ لیتی ہے۔

فنی چابک دستی نے اختر ہوشیار پوری کے شعر کو کہیں بھی دولخت نہیں ہونے دیا۔ان کے شعر کے دونوں مصرعے اتنے مربوط ہوتے ہیں جو ان کے قادرالکلام ہونے کو بنیاد فراہم کرتے ہیں ورگرنہ صورتِ حال یہ ہے کہ آج کے بیشتر کہنہ مشق شعراء پر یک مصرعی شاعر ہونے کی پھبتی کسی جارہی ہے۔

اختر ہوشیار پوری ایک اہم اور مختلف قسم کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں عمومی رنگ وآہنگ ہے۔لیکن یہ رنگ وآہنگ ان کی اپنی شناخت کے سائے میں پروان چڑھا ہے۔ان کی شاعری اظہار وابلاغ اور ترسیل وتفہیم کی الجھنوں کا شکار نہیں۔انہوں نے اپنا شعر چیستاں یا معما نہیں بننے دیا کہ کہیں ان کا قاری راستے سے بھٹک نہ جائے۔ان کے ہاں حقیقت پسندی صداقت اظہار کا نام ہے۔

اختر ہوشیار پوری کا تعلق اس مردم خیز خطہ زمین سے ہے جہاں کی نام ور اور نابغہ روزگار ہستیوں کے نام فوری طور پر ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں۔جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اختر ہوشیار پوری کا اصل نام عبدالسلام ہے۔آپ ڈاکٹر شیخ عبدالعزیز کے ہاں ۲۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔بی۔اے۔ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور اب تک وفاداری کا دم بھر رہے ہیں۔آپ نے ۱۹۳۴ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ باقاعدہ اصلاح کسی استاد سے نہیں لی بلکہ اپنی طبع موزوں ہی کو اپنا راہنما بنالیا۔

قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے قریباً سبھی معروف ادبی جرائد میں آپ کا کلام اشاعت پذیر ہوتا رہا۔جن میں سے چند رسائل کے نام یہ ہیں۔ادبی دنیا، ہمایوں، ساقی، ادب

Marfat.com

لطیف، نیرنگ خیال اور خیام وغیرہ۔

اختر ہوشیار پوری کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ علامت ۲۔ چراغ اور آئینہ ۳۔ سمت نما ۴۔ برگ سبز

۶۔ شہر حرف۔ ۷۔ مجتبیٰ ۸۔ رسالتمآبؐ ۹۔ خیر البشرؐ

۱۰۔ سرسوں کے پھول ۱۱۔ تنگنائے غزل

اختر ہوشیار پوری کا کلام عصر حاضر کے معروف اور مقتدر ادبی رسائل میں آج بھی تواتر کے ساتھ، نمایاں طور پر شائع ہو رہا ہے۔ ان کی باسٹھ سالہ ادبی خدمات تاریخ ادب کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

۱۹۹۴ء میں ''اوراق'' نے اختر ہوشیار پوری پر ایک بھرپور گوشہ شائع کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں۔

''اختر ہوشیار پوری نے لفظ کو تخلیقی انداز میں برتنے، اشیا اور مظاہر کو نئے امیجز کی مدد سے گرفت میں لینے اور عصر کے ہر نئے رجحان کو شعری شخصیت میں جذب کرنے کے بعد ان سب کے امتزاج سے ایک ایسا شعری منظر نامہ پیش کیا ہے۔ جو دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتا ہے''

احمد ظفر اختر ہوشیار پوری کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

''اختر ہوشیار پوری کے پائے کی غزل کہنا اس عصر کے بہت کم شاعروں کے نصیب میں آیا ہے۔ آج کے دور کے غزل گو شعراء صف اول کے غزل کہنے والوں میں آتے ہیں۔ ''سمت نما'' کے آخری حصے کی غزلیں تو کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا یہ سفر جاری ہے اور آئندہ بھی فن کی بلندیوں کو چھوتا رہے گا جو جدید لب و لہجہ کے غزل گو شعراء کیلئے سنگ میل ثابت ہوگا''

(''اوراق'' جولائی اگست ۱۹۹۴ء صفحہ ۴۶)

رشید نثار رقم طراز ہیں۔

''اختر ہوشیار پوری جب روشنی کو اپنے جسم میں قید کرنے میں کامیاب ہوا تو اس نے

Marfat.com

اس کی لَو میں اپنے چہرے کو دوبارہ دیکھا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے مکالمہ بھی کیا ہے۔ جب مکالمے میں کامیاب ہوکر وہ اپنے چہرے کو پہچاننے میں کامیاب ہوا تو اس نے ہمیں یہی بتایا ہے۔

اجنبی اور تھا، آشنا اور ہے
مجھ کو جس کا ہے، اب سامنا اور ہے

(''اوراق'' صفحہ ۴۹)

''شہر حرف کا عصری تناظر'' میں پروفیسر ریاض قدیر ریاض لکھتے ہیں۔

''شہر حرف'' کی شاعری کا خمیر ماضی و حال کی ان تعمیری اور ابدی اقدار سے اٹھایا گیا ہے جو نہ صرف مستقبل کی اقدار کا تعین کرتی ہیں بلکہ روشن مستقبل کی ضمانت بھی فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح اختر صاحب کی شاعری میں وقت کے تینوں دھارے ماضی، حال اور مستقبل ایک فطری تسلسل میں نظر آتے ہیں''۔

(ماہنامہ ''محفل'' ستمبر ۱۹۹۵ء صفحہ ۵۷)

تازہ پھولوں کی بھی راہوں میں مہک ہوتی ہے
ہر قدم پیڑ پر انے بھی ہوا کرتے ہیں!

☆☆☆

عصرِ کہن کے ڈوبتے تاروں کی ضو بھی ہم
تہذیب نو کی صبح کے آثار بھی ہمیں

☆☆☆

Marfat.com

نئے موسموں کا شاعر۔ ساحل احمد

ساحل احمد کے نام اور کام کو آج کا کج فکر نقاد کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ساحل احمد نے اردو ادب کے شیش محل میں اپنے خون جگر سے جن چراغوں کو فروزاں کیا ہے، ان کی روشنی آنے والی صدیوں میں تادیر رہے گی۔ اس کے فکر کی گہرائی دلوں کو مسحور اور روحوں کو مغلوب کرتی رہے گی۔

ساحل احمد نے عصری حقائق کی آگہی سے بے توجہی کا رویہ نہیں اپنایا۔ اس نے جدید حسیت کو روایت کی چکنی مٹی میں گوندھ کر اپنی شاعری کی نوک پلک اس انداز سے سنواری ہے کہ اس کے ہم عصر قد آور شعرا میں اس کی انفرادیت کی شناخت گم نہیں ہونے پاتی۔ اس کی لفظیات کے آہنگ اور تلازمات میں وہ معنوی تہہ داری ہے جو اس کی شعری کائنات کے بلند و بالا مینار کے جگمگاتے کلس کا روپ دھار چکی ہے۔ اس کی فکری اڑان داخلیت کے خول سے نکل کر خارجیت کے مشاہداتی میدانوں میں فطرت سے ہم آہنگ ہو کر قلانچیں بھر رہی ہے!

منکشف تم پر ہو ساری کائنات
آئینوں میں آئینہ دیکھا کرو

☆☆☆

سر پہ نیلا آسماں ، نیچے زمیں
اب کہیں ملتا نہیں سایہ مجھے !
چشم پوشی قاتلوں کی دیکھئے !
لگ رہے ہیں کس قدر معصوم سب

Marfat.com

جن مناظر کا اس نے ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ دل کی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے، وہ اپنے قاری کو ان مناظر کو دکھانے اور اپنے تجربات میں شراکت کا آرزومند ہے۔ ساحل احمد کی ہنر مندی، اس کے قاری کو دھیرے دھیرے اپنے اعتماد میں لے کر اپنائیت کا جادو جگا رہی ہے۔

آسمان تیری گلی میں کیا رہوں ؟
ان جلے ٹوٹے گھروں کو دیکھ کر

☆☆☆

روشنی کیسی مقید ہے یہاں ؟
بند شیشے کا مکاں ہے دیکھئے

ساحل احمد یاس و قنوطیت کا شاعر نہیں بلکہ امید و رجا کا اور نئے موسموں کا شاعر ہے۔ اس نے نراشا کے مندر ہیں آشاؤں کے دیپ جلا رکھے ہیں۔ اس کے ان شعروں میں اسکی شاعری کا منشور منضبط صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

آگہی کا نیا خیال تراش
شعر میں نقطہء جمال تراش

☆☆☆

بات نقطوں میں پھیل جائے تو پھر
صفحہء فکر خدوخال تراش !

☆☆☆

یاسیت ہے دلوں میں آج بہت
کوئی تو صورتِ وصال تراش

پروفیسر عنوان چشتی ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انہوں (ساحل احمد) نے جمادات، نباتات اور حیوانات کی مانوس دنیا سے علامتیں

Marfat.com

اخذ کی ہیں۔ ان میں بعض علامتوں پر نجی علامتوں کا گمان ہوتا ہے مگر ان علامتوں کے تلازمی رشتوں کی گرہیں سخت نہیں ہیں بلکہ ان پر اپنے معنی اور اس کے متعلقات کا اظہار کرتی ہیں‘‘

زرد گلوں کا چہرا تھا
سبز کنارا جلتا تھا
دھول میں لپٹی یادوں کا
ایک غبارا اڑتا تھا
تیز ہوا میں سایہ بھی
بھاگا بھاگا پھرتا تھا
گھیر لیا تھا موجوں نے
پاؤں ندی میں رکھا تھا
موسم ساحل پہلے بھی
جھوٹی خبریں دیتا تھا !

بمل کرشن اشک اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں۔

’’ساحل احمد اچھے شاعر ہیں بڑے شاعر تو خیر فراق کے بعد پیدا ہونے بند ہو چکے ہیں، لیکن ایسے بھی کتنے شاعر ہیں؟ جنہیں اچھا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ جن چند نئے شعرا سے بڑے بننے کی امید کی جا سکتی ہے۔ ان میں ساحل احمد بھی ایک ہیں۔ خدا کرے نقادوں کی نظر ہمارے اچھے شاعروں کی طرف پڑے تو بے دلی سے پیٹھ نہ موڑیں۔‘‘

ساحل احمد نے اپنی شاعری میں موسموں سے نہ جانے کتنے رنگ سمو دیے ہیں جیسے

مہکی ڈالی پھولوں کی
دھوم مچے گی جھولوں کی

Marfat.com

گیت لکھوں نہ موسم کا
نیند اڑے گی پھولوں کی
آب و ہوا کی چشمک پر
رنگت بدلی پھولوں کی
چھائی حکومت جنگل میں
مٹی ریت بگولوں کی
رنگ بدلتے کانٹوں کو
فکر بہت تھی پھولوں کی

پروفیسر محمد اکرم رضا، ساحل احمد کے شعری مجموعے ''موسم'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ساحل احمد کی غزلوں میں حسن تغزل کی چمک بھی ہے اور معنی آفرینی بھی ان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ بھی ہے اور ان کے استعمال کا سلیقہ بھی وہ ہمالہ صفت حقائق کو لفظوں کے اجلے پیرہن میں ملبوس کرنے کا انداز جانتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی غزل عصر حاضر کے فکری اثاثے کی امین اور فنی تقاضوں پر پوری اترتی ہے۔''

ساحل احمد نے موسم کے پردے میں نہ جانے کتنے موسموں کی بات کر دی ہے۔ ایسے موسم جو امر بھی ہیں اور ایسے موسم جو ذرا سی دیر کو ابھرتے ہیں اور اپنے لافانی نقوش صفحہ حیات پر ثبت کر کے وقت کی آغوش میں جا سوتے ہیں۔

دھوپ نہا کر نکلی ہے
سبز گناہ کی ٹہنی ہے
پیر بچا کر رکھنا تم
آگے ٹھہرا پانی ہے

Marfat.com

ابر ٹکے تھے شاخوں پر
ہار خوشی کا پہنا تھا
بال کھلے تھے بارش کے
سبز کتابی چہرا تھا !

ڈاکٹر ذکاالدین شایان اپنے مضمون ''ساحل احمد کے تخلیقی ذہن کے سفر میں نئی غزل'' میں یوں اظہار خیال فرماتے ہیں۔

''شاعری کے دائرے میں یوں تو ساحل احمد نے نظم، مثلث اور ہائیکو وغیرہ نئی شعری اصناف کو تجرباتی سطح پر اپنایا ہے اور ان میں کہیں کامیاب ہیں اور اکثر ناکام۔ لیکن ان کے اصل جوہر غزل ہی میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدت احساس اور شدت بیان دونوں کی پیوستہ لہریں اتنی ساتھ ساتھ چلتی ہیں کہ بیشتر جگہ لاشوری طور پر صنف مثنوی کے قریب تک آجاتی ہیں''

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ساحل احمد کی مسلسل غزلوں کی مثنوی پر تطبیق کی ہے جو میرے خیال میں درست نہیں، فراق، ناصر کاظمی اور سراج الدین ظفر نے ہی نہیں آج کے بیشتر جدید غزل گو شاعروں نے مسلسل غزلیں کہی ہیں۔ شاعری کے ناقدین نے اسے خامی نہیں بلکہ خوبی سے تعبیر کیا ہے۔

نامور ترقی پسند نقاد احتشام حسین نے ساحل احمد کا حوصلہ یوں بڑھایا ہے:

''ساحل احمد خوش فکر شاعر بھی ہیں اور اچھے شعروادب کے نباض بھی''

فراق گھورکھ پوری نے لکھا تھا:

''ان (ساحل احمد) کے انداز فکر میں خلوص وصداقت ہے اور ان کا انداز بیان محتاط ہے''

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

Marfat.com

''آپ کی غزلوں میں بعض بڑے خوب صورت امیجز ابھرے ہیں۔ان میں جگہ جگہ خیال کی تازگی نیز اسلوب کی تازگی اپنی جھلک دکھاتی ہے۔''

مذکورہ معتبر آراء کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ساحل احمد عصر حاضر کا وہ نمائندہ شاعر ہے جس نے غزل ہی کی نہیں بلکہ اپنے عہد کی نمائندگی کا فریضہ بھی بڑی خوش سلیقگی سے ادا کیا ہے۔ اس کی شاعری میں وہ تمام عوامل کارفرما نظر آتے ہیں جو اچھی شاعری کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

اڑتی ہیں خوشبوئیں سی جو وادی میں بے قرار
ان کو نشان آمدِ فصلِ بہار لکھ

☆☆☆

سر پر ازل سے تاج صعوبت ہے جلوہ ریز
تختِ غم و الم کا مجھے شہر یار لکھ

ساحل احمد نے فکری اور اسلوبیاتی حوالے کا سہارا لے کر اپنی شاعری کو لوک دانش سے ہم کنار کیا ہے۔اس کی سادگی اور سادہ بیانی نے اپنی عہدیتی بے چہرگی کو بغیر کسی الجھاؤ کے منظر عام پر لانے کی بے مثال کوشش کی ہے۔ وہ ادق اور مغلق الفاظ کی بھول بھلیوں میں اپنے قاری کو نہیں الجھاتا۔اس کی شاعری ترسیل وابلاغ اور فہم وادارک کی سطح زمین پر سفر کرتی ہے۔اس کی ان دیکھے اور ماورائی جہانوں میں پرواز نہیں۔ وہ اسی دھرتی اور دھرتی باسیوں کے مسائل حیات کی بات کرتا ہے۔ وہ اسی کائنات، اسی جہان اور اسی دنیا کی متنوع کیفیتوں سے دوچار ہے، جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔

ساحل احمد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم الہ آباد اور علی گڑھ میں حاصل کی۔ایم اے اردو کرنے کے بعد ۱۹۶۴ء سے درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آج کل ریونگ کرسچن کالج الہ آباد میں پڑھا رہے ہیں۔

ساحل احمد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک کہانی کار کی حیثیت سے کیا ڈرامے بھی

Marfat.com

لکھے۔تنقید اور تحقیق کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔اسلیئے شاعری کا رنگ زیادہ چڑھا اور اسی میں ساحل احمد سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ ہزار سے زائد غزلیں اور نظمیں پاک و ہند کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔

ساحل احمد نے اردو کی خدمت کیلیئے ایک اشاعتی ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ اردو رائٹرس گلڈ آلہ آباد کے زیر اہتمام انہوں نے بے شمار کتابیں شائع کیں۔اپنا تمام ذاتی سرمایہ اسی خدمت میں صرف کر دیا۔ان کی مطبوعہ کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	۲۔ غزل، پس منظر، پیش منظر
۳۔ ولی، فن شخصیت اور کلام	۴۔ یازدہ
۵۔ اقبال اور اردو غزل	۶۔ اردو میں گل دستوں کی روایت
۷۔ چہرہ	۸۔ برگ نامہ
۹۔ ریزہ گل	۱۰۔ موسم

ان کے علاوہ ترتیب و تدوین کی شکل میں ساحل احمد کی مندرجہ ذیل کتب منظر عام پر آ چکی ہیں:
۱۔شعری ادب ۲۔اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ ۳۔اعتبار نغمہ ناصر کاظمی کی غزلیں ۴۔اے دل تو ہی بتا (مجید امجد کی غزلیں) ۵۔اکبر الہ آبادی کی شاعری ۶۔ فانی بدایونی ۷۔مطالعہ مومن ۸۔ مرزا یگانہ ۹۔محمد حسین آزاد کا تنقیدی مطالعہ۔

علاوہ ازیں ساحل احمد کی دو درجن کتابیں چھپنے کی منتظر ہیں۔شاید ان کی اشاعت کا مرحلہ بھی طے ہو جاتا اگر وہ جولائی ۱۹۹۴ء میں اچانک ایک حادثے کی لپیٹ میں نہ آ جاتے۔ اس حادثے مین ان کے دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی۔کئی آپریشن ہوئے اور علاج کی اذیت ناکیوں سے انہیں گزرنا پڑا۔بڑی معقول رقم خرچ کرنے کے باوجود ان کا دایاں ہاتھ مفلوج ہو چکا ہے۔اب وہ بائیں ہاتھ سے بڑی مشکل سے لکھتے ہیں۔ان کا خط اتنا شکستہ ہوتا ہے کہ پڑھا بھی نہیں جاتا۔ان کی شاعری میں ایک کرب ناک سی [illegible]یت در آ[illegible] ہے۔

Marfat.com

تم کو اندازہ نہیں ہے شہر کا
باندھ کر سر پر کفن نکلا کرو

☆☆☆

جلے پتوں کے چہروں پر خزاں آلود نقطے ہیں
اگر جانا تو گل کی بھی کوئی پہچان لے جانا

☆☆☆

تم کو ساحل زیب یہ دیتا نہیں
پیٹھ پیچھے غیبتیں کرتے رہو

☆☆☆

ٹوٹے پھوٹے جسموں سے
لٹکے مردہ چہرے ہیں

☆☆☆

سب گذرتے ہیں کنارا کاٹ کر
رکھ دیا جو گھر کے باہر آئینہ

☆☆☆

ایک چٹکی خاک لے کر ہاتھ میں
اپنے بارے میں کبھی سوچا کر

☆☆☆

غم کا بیوپاری ہوں ساحل کیا کہوں
یہ ہنر مشہور مجھ کو کر گیا !

Marfat.com

ساحل احمد کا فکری میلان معاشرے کی تطہیر، انسانیت کی سربلندی، فرد کی آزادی اور بہبود سے ہم آہنگ ہے۔ اس کے کڑے اصول اور سخت ترین قواعد وضوابط ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونا، اس نے اپنے آپ پر فرض کرلیا ہے۔

ساحل احمد کی شاعری جاذبیت، دل کشی اور تاثیریت کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ کفایت لفظی بھی اس کی شاعری کا ایک حسین وصف ہے۔ جو عہد حاضر کے بہت ہی کم شعراء کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ رنگا رنگ تراکیب اور بے ہنگم الفاظ کا اجتماع شاعری نہیں بلکہ شاعری وہ ہے جو کم سے کم الفاظ میں ایک بھرپور مضمون لے کر طلوع ہو اور دلوں کو چھیدتی چلی جائے۔ ساحل احمد کے ہاں ایسے بے شمار اشعار ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے گمبھیر لہجے کے غماز یہ شعر دیکھتے چلیے!

اچھا ہوا کہ آپ کی محفل سے اٹھ گیا
میری کسی سے دوستی یا دشمنی نہیں

☆☆☆

برگ پیلے ہوئے تو کانٹے بھی
ہر عداوت کو بھول جاتے ہیں

☆☆☆

خامشی ہوتی ہے رموز ہستی!
خود اذیت کے جو منظر دیکھو

☆☆☆

میں ہمیشہ ہی بادشاہ کی طرح
جھوٹی سچی کہانیوں میں رہا

Marfat.com

☆☆☆

اب شرافت کا یہی معیار ہے
سر جھکا ہو ایک سر کے سامنے

☆☆☆

ایک عجب ماتم بپا ہے شہر میں
خوف کا ہر شخص پہنے ہے لباس !

حوالہ جات

۱۔ سہ ماہی ''ابلاغ'' پشاور اپریل ۹۴ء
۲۔ ''مفیض'' گوجرانوالہ دسمبر ۹۲ء
۳۔ ''ریزہ گل'' ساحل احمد
۴۔ ''موسم'' ساحل احمد
۵۔ ''ذاتی خط'' ساحل احمد

Marfat.com

نرمان

1991 میں افتخارنسیم نے جب اپنا پہلا غزل مجموعہ ''غزال'' مجھے بھجا اب تو اسے پڑھ کر میرے ذہن میں ان جانے سے خدشات سرسرائے! افتخار جیسا ہے؟ ویسا نہیں ہے۔ شاید وہ دوہری شخصیت گذار رہا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے تو میں چونک اٹھا:

پناہ دیتا نہیں کوئی اور سیارہ
بھٹک رہا ہوں خلا میں، زمین سے دور ہوں میں

☆☆☆

کوئی نہیں جو مری لو سے راستہ دیکھے
ہوائے تند بجھادے ترے حضور ہوں میں

☆☆☆

عذاب یہ ہے کہ تنہا کٹے گی عمر تمام
سفر کے بعد کوئی ہم سفر ملے گا مجھے

☆☆☆

سب ایک سے ہوتے ہیں تو میں سب سے الگ کیوں
یہ راز وہ مجھ پر کبھی کھلنے نہیں دیتا!

☆☆☆

یہ کون مجھ کو ادھورا بنا کے چھوڑ گیا
پلٹ کے میرا مصور کبھی نہیں آیا!

Marfat.com

عذاب جان پہ اب اور سہہ نہیں سکتا
میں جس طرح کا ہوں، جیسا ہوں کہہ نہیں سکتا

☆☆☆

میں تمہیں اڑتا ہوا دیکھوں گا میرے ساتھیو!
میں تمہارا ساتھ کیسے دوں شکستہ پر ہوں میں

اس پر شکستہ، ادھورے، سب سے الگ، عزلت گزیدہ بلکہ مردم گزیدہ افتخار نسیم کا دوسرا مجموعہ ''نرمان'' انجم سلیمی نے میرے خصوصی مطالعے کے لئے عطا کیا تو میرے تمام خدشات یقین کی سرحد پار کر گئے! افتخار نسیم نے اپنے ''نرمان'' کو منظر عام پر لا کر جس سچ کا زہر پیا ہے، وہ میرے یا آپ کے بس کی بات نہیں۔

سارتر انسان کو ایک بااختیار وجود سمجھتا ہے۔ جو اپنی نشوونما اور اپنے انتخاب میں بالکل آزاد ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کا پیدا ہونا، اس کے بس میں نہیں۔ لیکن اس کے بعد کے سبھی اختیارات اس کے پاس ہیں۔

افتخار نسیم نے ''خود دریافتگی'' کے ہنر کو جس طرح آزمایا ہے، وہ اس کی جرات مندانہ ہی نہیں بلکہ ازلی سچائی کا ایک تلخ ترین اظہار ہے۔ افتخار نے تسلیم کیا ہے:

''یہ صرف ایک سچائی ہے جس کا اظہار میں نے لفظوں میں کر دیا ہے کہ میں اندھیرے کا آدمی بن کر زندہ رہنا گوارہ نہیں کرتا۔ اس سچائی کے ناکردہ اظہار سے میرے اندر کتنا زہر بھرا ہوا تھا جو نکل گیا۔''

''ہر سچائی اور ہر عمل انسانی ماحول اور انسانی داخلیت کا پرتو ہے'' (سارتر)

افتخار نسیم اپنی نظم ''میرے بابا'' میں اپنی جنس کے حوالے سے سراپا سوال ہے:

میرے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے
میں جو بالکل آپ پہ ہوں

Marfat.com

تو پھر میری ترجیح جنس
آپ سے کیوں اس درجہ الگ ہے؟

نظم ''پل صراط'' میں افتخار اپنے بارے میں انکشاف کرتا ہے:

اب بتانے سے تجھے کیا فائدہ
کس عذاب دردِ پیہم سے ہوں گزرا

یہ نہ پوچھ
صحبت ناجنس سے میں صحبت ہم جنس تک

جب میں نے ڈاکٹر خالد سہیل کی کتاب ''ہر دور میں مصلوب'' جو کہ لسبین (Lesbian) اور گے (Gay) کلچر کے حوالے سے مضامین، افسانوں، نظموں اور تراجم پر مشتمل ہے، پڑھی تو میں ایک اور ہی دنیا کے لوگوں سے متعارف ہوا۔ اس دنیا کے رہنے والے اپنے ہی جیسے، اپنے ہی ہم عمروں سے محبت کے قائل نظر آئے۔ خالد سہیل نے نفسیات کے آئینہ میں بتایا ہے:

''ماہرین کا خیال ہے کہ ہومیوسیکشول لوگ اپنی تصوارتی زندگی (Fantasy LIfe) میں اپنی ہی جنس کی قربت کو جنس مخالف پر ترجیح دیتے ہیں، اور اس سے لذت حاصل کرتے ہیں۔
''بعض لوگ نظریاتی طور پر جنسی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں، ان میں وہ فیمسنٹ (Famismists) شامل ہیں جو مردوں سے تمام تر قربت کے رشتے منقطع کر چکی ہیں اور صرف عورتوں سے جذباتی اور جنسی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں'' (صفحہ 60-59)

افتخار نسیم کا 12 مارچ 1992 کا ایک خط اپنی بہن کے نام بھی اسی کتاب یعنی ''ہر دور میں مصلوب'' میں شائع ہوا ہے۔ جس میں اس نے اعتراف کیا ہے:

''بہر حال بہن! میں ایک عذاب سے گزر کر ایک پرسکون جنت میں داخل ہو چکا ہوں۔ اگر تم یہ چاہو کہ شادی کر کے تم لوگوں کا دوسرے لوگوں میں ناک اونچا کر دوں تو یہ مجھ

Marfat.com

سے نہیں ہو سکے گا۔ (صفحہ 46-145)

اپنے ایک مضمون ''گے کلچر'' میں افتخار نسیم لکھتا ہے:

''Gay ایک طرز زندگی ہے، جس میں ایک شخص معاشرے کے سامنے اپنے عمل سے یا اپنے رہن سہن سے کھل کر یہ اظہار کر دیتا ہے کہ وہ اپنے جیسوں کو پسند کرتا ہے اور انہیں کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اسلئے وہ کسی قسم کی منافقت سے کام نہیں لیتا۔''

(ماہنامہ تخلیق لاہور۔ اکتوبر 95ء صفحہ 116)

ایک نظم میں افتخار نے اپنی فطرت کا روز یوں افشا کیا ہے:

مجھے بچپن ہی سے گڑیوں سے کھیلنا اچھا لگتا تھا
میرے ہم جولی جب ہوائی جہاز
گھوڑے، بیل، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور سب
مردانہ کھیل کھیلتے تھے
تو اس وقت میں گڑیوں کے بال سنوارا کرتا تھا
ان سے باتیں کرتا تھا

افتخار نسیم کا ناسٹلیجیا سے انسلاک اس کی سوچ کی جھیل میں ہر آن کنکر پھینک کر اسے ایک ایسے کرب سے دوچار رکھتا ہے جس سے اس کی فکری گمبھیرتا نکھر نکھر جاتی ہے۔ اس کے چاروں جانب بیتے سمے کے سنہری جال تنے ہوئے ہیں۔ وہ ان جالوں سے نکلنے کی لاکھ کوشش کرے، نکل نہیں سکتا! وہ نکلے بھی تو کیسے نکلے؟ یہی تو اس کو زندگی کی ڈھارس بندھائے ہوئے ہیں اور شاید افتخار اس ڈھارس کے حصار کو توڑنا نہیں چاہتا۔ بیتے دنوں نے اس کی روح اور بدن میں اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں کہ وہ حال اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر زندگی کرنے کا ہنر آزما رہا ہے!

انجم سلیمی نے ''نرمان'' کے پس سرورق پر ''نرمان'' کی وضاحت یوں کی ہے:

''نرمان'' جدید فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب یونانی دیوتا

Marfat.com

Hermaphrodite ہے جو آدھا مرد اور آدھی عورت تھا۔''

''اردو زبان میں ''نرمان'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور ہمارے معاشرتی اقدار پر ایک ضرب لیکن جرات اظہار کی داد نہ دینا بھی منافقت کے مترادف ہے۔ ادبی حیثیت سے کتاب میں صرف متعینہ اقدار کی ٹوٹ پھوٹ شامل نہیں بلکہ امن اور انسانیت کا پیغام بھی ہے جو خوب صورت شعری زبان میں ہم تک پہنچایا گیا ہے، اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا تیسری آنکھ سے یہ سب بھی دکھائی دیتا ہے؟''

(ماہنامہ ''صریر'' کراچی، ستمبر 1995ء صفحہ 83)

افتخار نسیم اپنے راز اپنے آپ سے بھی اک عمر چھپا کر جیتا رہا! اس نے ''نرمان'' کی صورت میں اپنے تجربات ہی بیان نہیں کیے بلکہ ان پر یقین کی مہریں بھی ثبت کی ہیں۔

افتخار نسیم کے یہاں تخلیقیت کے عناصر کی دریافت کا مسئلہ ایک گمبھیر صورت اختیار کر گیا ہے۔ نقادان فن کو معنیاتی سطح پر ناپختہ جذباتیت کی لہریں تو دکھائی دیں گی لیکن ان لہروں میں جو گہرائی ہے، اس گہرائی میں افتخار نسیم کی روح پگھل کر شامل ہو گئی ہے!

افتخار نسیم کی شخصیت کی محبوبیت نہ جانے کتنے دلوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ اس نے دیار غیر (شکاگو) میں محبت کی شمع جلا رکھی ہے۔ اس شمع کا طواف کرنے دور دراز سے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والوں میں عصر حاضر کی مشہور و مقبول مایہ ناز ہستیاں بھی ہیں جو افتخار نسیم (ہمارے افتی) کی مہمان نوازی اور محبت کی اسیر ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

مشکِ منور

کرشن کمار طور کی غزل میں تخلیقی فکر وبصیرت، جدت طرازی اور تازہ کاری کی وہ کہکشاں ہے، جس کی کشش اپنا ایک منفرد انداز رکھتی ہے۔ غزل اگر سچے جذبات کی ترجمان ہو تو اس کا بانک پن کبھی ماند نہیں پڑتا۔ کرشن کمار طور کے غزل مجموعے ''مشک منور'' میں ایسے بے شمار اشعار ہیں جو دل کو چھوتے ہی نہیں بلکہ دل پر نقش بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کی غزل کے یہ شعر دیکھئے جو اپنی اثر آفرینی میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔

الگ کر کے جو دیکھیں خود کو سب سے
پرائے کم، یہاں اپنے بہت ہیں!

☆☆☆

تمہیں چاہا ہے، بس اتنا ہی سچ ہے
مگر اس بات کے چرچے بہت ہیں

☆☆☆

نہ ملنا ہو تو مشکل ہر قدم پر
اگر چاہو تو پھر رستے بہت ہیں

☆☆☆

ابھی واقف نہیں رسم جہاں سے
مرے بچے ابھی ہنستے بہت ہیں

☆☆☆

Marfat.com

یہی اک وجہ ان سے پیار کی ہے
وہ کچھ بھی ہوں مگر اچھے بہت ہیں

☆☆☆

اسی اک بات پر ہوں طور زندہ
مرے اندر کے دروازے بہت ہیں !

کرشن کمار طور کے تخلیقی سفر میں ایک طویل مدت کی ریاضت کارفرما ہے۔ ان کے شعری سفر کے جو سنگ میل اب تک سامنے آئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

دریافت

ترتیب

شعر شگفت

عالم عین

نمونو یداور مشک منور

''مشک منور'' کے پس سرورق پر عصر حاضر کے ممتاز شاعر اور جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''کرشن کمار طور کی غزل میں ایک طرفہ درویشانہ رنگ ہے۔ یعنی طور کے یہاں وہ کیفیت جگہ جگہ ملتی ہے کہ شاعر ہر چیز کو اپنی شخصیت یا روحانی تصرفات کے زیر نگیں دیکھتا ہے۔ اسے نارسائی اور ناکامی کا احساس تو ہے لیکن شکست کا احساس نہیں۔ وہ الفاظ کی رنگارنگی کو معنی کی وحدت میں بدل دیتا ہے اور ہر جگہ حقیقت ازلی کا کھیل دیکھتا ہے۔''

طور کے درویشانہ مسلک کے حوالے سے چند شعر ''مشک منور'' سے انتخاب ہیں جو فاروقی کی بات کی سچائی کے گواہ ہیں:

Marfat.com

ہم سے فقیر منش لوگوں سے ملنا تھا !
دیکھے تو ہوں گے تم نے یوں انسان بہت

☆☆☆

اب مٹی کا قرض چکانا باقی ہے
باندھ لیے تو نے عہد و پیمان بہت

☆☆☆

طور اٹھو اب اپنی جھولی خالی کرو
جمع کر چکے جینے کا سامان بہت

☆☆☆

خود اپنے آپ کو پہلے سلام میں نے کیا
پھر اس کے بعد خدا سے کلام میں نے کیا

☆☆☆

دل کی دولت سے بڑی ان کو نہیں کوئی شے
پاؤں میں رکھتے ہیں درویش تو سلطانی کو

☆☆☆

ہر حقیقت کو بنا ڈالا ہے باطل ہم نے
تکیہ سنگ کیا ، تخت سلیمانی کو

☆☆☆

پوجتے ہم ہیں بتوں کو بھی خدا کر کے مگر
دیکھتا کون ہے اس جذبہ ایمانی کو

☆☆☆

Marfat.com

اک اسی نام کی ہے گونج مرے چاروں طرف
طور اب اور سنائی نہیں دیتا مجھ کو

کرشن کمار طور جدید طرز فکر کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جنہوں نے ساٹھ کی دہائی میں روائتی شاعری کو نئی کروٹ دی۔ ان کے ساتھ چلنے والوں نے اپنی بے معنی جدیدیت کا وہ ڈھنڈورا پیٹا کہ کان پڑی آواز بھی بمشکل سنائی دے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو جدید شاعری کا امام کہلوانے پر بھی مصر رہے! مگر کرشن کمار طور کی درویشی دیکھئے کہ ایک طویل مدت سے ان کا کلام برصغیر (پاک و ہند) کے معروف ادبی رسائل و جرائد میں تواترے اشاعت پذیر ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی لاف زنی نہیں کی اور نہ کبھی اپنے آپ کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی کہ ان کا قد، ان کے معاصرین سے اونچا نظر آئے!

کرشن کمار طور نے اپنی شاعری کو اپنی دھرتی، اپنی تہذیب اور اپنے ماحول کی مرکزیت سے منسوب کیا ہے۔ مٹی، لہو، پانی، ہوا، آگ، خوشبو، گھر، دعا، دشت، گلاب اسی زمین کے استعارے ہیں۔ ''مٹی'' کو انہوں نے کیسی معنوی تہہ داری سے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے، اس حوالے سے ''مشک منور'' سے چند شعر:

مرے نمو میں مری اپنی مٹی مانع تھی
مرے خدا نے مجھے بے صدا تو کرنا تھا

☆☆☆

یہ کیا کہ دھڑ تو ہیں موجود اور سر غائب
یہ کیسی مٹی ہے، کیوں اس میں ہیں نشان بہت

☆☆☆

مجھے نہ دیکھ الگ کر کے میری مٹی سے
یہی زمیں ہے نمایاں مری نشانی میں

Marfat.com

منتقل کردوں گا میں پھر سے نمو مٹی میں
میری آنکھوں میں لہو، لہروں میں پانی تو رہے

☆☆☆

تمہارے ہونے کا یہ مٹی مانگتی ہے ثبوت
تم ایک چہرہ ہی ہر انتخاب میں رکھنا

☆☆☆

میرے ہر پندار کو زندہ رکھتی ہے
مجھ پر یہ احسان ہے کیا کم مٹی کا

☆☆☆

پرت پرت میں کتنے جہاں آباد ہیں طور
اک اسم اعظم ہے ہر دم مٹی کا

☆☆☆

اس دنیا کو کیوں کوستے رہتے ہو طور
مٹی ہی آخر خیر خواہ ہے مٹی کی

☆☆☆

زمین مٹی کی ، آفتاب مٹی کا
دنیا میں سارا حساب کتاب مٹی کا

☆☆☆

دل کو اکسیر یہی مٹی ہے !
موج میں آئے تو گماں رکھ دینا

☆☆☆

Marfat.com

توقع رکھنی ہے تو رکھ وفا کی مٹی سے
یہ جنس وہ ہے کہ جو رائیگاں بہت کم ہے

آج ہر شخص گھر میں رہتے ہوئے بھی بے گھری کے المیے سے دوچار ہے! وہ گھر جو انسان کیلئے ایک تحفظ کی علامت تھا۔ وقت نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اب انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا ہے۔ کرشن کمار طور کے یہاں بھی اس المیے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مری دعاؤں کی کچھ صورت ثمر ہی نہیں
سمجھ رہا ہوں جسے گھر وہ میرا گھر ہی نہیں

☆☆☆

علاوہ خانہ دل کے جہاں میں
کہیں رہنے کو گھر بھی چاہیے ہے

''مشک منور'' کو پڑھ کر میں بڑی ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ کرشن کمار طور کی ذہنی انسلاکیت صوفی شعراء سے ہے۔ اس کے درویشانہ طرز فکر سے متعلق تو آپ نے اشعار پڑھ ہی لیے، اب دیکھیں کہ وہ اپنے ہاتھوں کے خالی کاسے اٹھائے، اپنے خالق کے حضور کن دعاؤں اور التجاؤں میں مشغول نظر آتا ہے۔

وہ آنکھ کھولے نہ کھولے وہ اب سنے نہ سنے
بلند طور یہ دست دعا تو کرنا ہے

☆☆☆

مٹھاس ہونٹوں سے اک شہد سی ٹپکتی ہے
جو ورد کرتی ہے اس نام کا زبان بہت

☆☆☆

Marfat.com

کسی دعا کے اثر کا ثمر ثبوت ہے طور
وہ اک ستارہ جو پلکوں پہ جھلملاتا ہے پھر

☆☆☆

سب کچھ تیرے سامنے ہے
میں اب خدا کہوں گا کیا

☆☆☆

عمر اخیر میں بھی ہوں اتنا ہی تازہ کار
روشن ہیں گل یقین کے دشت دعا میں بھی

☆☆☆

دعا کے پھول ، اس کا عکس ، دنیا
بدن کی سیپ میں مستور دیکھوں

☆☆☆

بہر تسکین دعا ہاتھ اٹھاتے رہیے
نقش پانی پہ سہی پھر بھی بناتے رہیے

☆☆☆

شفق سی ہو آنکھیں میں، ہونٹوں پہ اک دعا رکھنا
تم اپنے چہرے کو اس کیلئے سجا رکھنا !

☆☆☆

تراش دینا دلوں میں کوئی وفا کا گھر
ہر ایک ہونٹ پہ نازک سی اک دعا رکھنا

☆☆☆

Marfat.com

گماں کا پردہ اک ہوا میں تھا
مزا کچھ اور ہی دعا میں تھا

☆☆☆

یہ راز کیا ہے ، کون بتائے بھلا کہ کیوں
پھیلے ہوئے ہیں دست دعا سارے شہر میں

☆☆☆

اسے میں اپنے مقابل کروں تو کیسے کروں
یہ آرزو بھی دعا تھی کہ اب تمام ہوئی

☆☆☆

یہ کیسی دنیا ہے اے طور یہ جہاں ہے کیا
کہ ایک حرف شکستہ مری دعا ہے یہاں

☆☆☆

ہر ایک سانس معطر ہے اس کے ذکر سے طور
بدن میں خوشبو سا پھیلا بس ایک اسی کا نام

بھارت میں اردو زبان سے جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ اسے ہر صاحب دل محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طور کا اس حوالے سے یہ روشن شعر بھی اہمیت رکھتا ہے۔

جانے یہ مٹنے کے ہیں آثار یا کچھ اور طور
لوگ کہتے ہیں کہ ہے اردو زباں روشن بہت

☆☆☆

Marfat.com

قطرہ اک لہو کا

علی احمد شاہد ایک ایسے پختہ فکر افسانہ نگار ہیں جنہوں نے زندگی کی ہر بہت کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا ہے۔ان کی کہانیاں، ان کے افسانے زندگی کے آئینے ہیں۔جن میں ہر شخص حسب توفیق اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔وہ چہرہ خوب صورت ہے یا مکدر یا اس میں کجی ہے تو الزام آئینہ بردار پر آئے گا مگر آئینہ بردار کسی کا دید لحاظ نہیں کرتا۔وہ تو لوگوں کو ان کی صورتیں (جیسی بھی ہیں) دکھاتا چلا جا رہا ہے۔اس کی چال، وقت کی چال ہے۔اس کا فیصلہ وقت کا فیصلہ ہے اور وقت کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا ہے۔

''قطرہ اک لہو کا'' ایک جواں مرگ بیٹے کے باپ کی داستان کرب ہے اور یہ کرب ایک ایسی آگ ہے جو اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوگی۔جب تک مرحوم بیٹے کی یاد کی بادِ صرصر چلتی رہے گی۔علی احمد شاہد کے افسانوں کی زبان اپنے عہد کی روح سے ہم آہنگی کا احساس دلا رہی ہے۔اثر انگیزی کا ایک دل نشین انداز ان کے ہر افسانے میں پڑھنے والے کو نظر آئے گا۔

''گھر تو آخر اپنا ہے'' میں علی احمد شاہد ان ہم وطنوں سے مخاطب ہیں جو اپنے گھر کی آدھی چھوڑ کر دیارِ غیر میں سالم روٹی کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں اور اپنی محنت سے اپنے خون پسینے سے اغیار کی معیشت کو استحکام بخش رہے ہیں، اپنے وطن میں محنت کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

''تمہیں بھی چاہیے کہ اپنے ملک کی حدود میں رہ کر اپنے وطن کی تعمیر میں لگ جاؤ، پیشے کی حرمت کو اپنا شعار بناؤ''

علی احمد شاہد میں ایک سیاہی وقائع نگار کی بصیرت اور بصارت بھی ہے۔افسانہ ''فریم'' میں

Marfat.com

لکھتے ہیں۔

''حاجی کریم درجنوں جلسوں میں دیکھتے ہیں۔ چہرے بڑے ہیں اور پیٹ بھاری ہیں اور آوازیں بھی بلند اور طرار ہیں اور وہ گذشتہ نصف صدی سے یہی بات دہرا رہے ہیں۔ یہ جو تباہ کن حالات ہیں اور غربت وناداری ہے۔ بیروزگاری اور بیماری ہے، یہ سب ہمیں گزشتہ حکمرانوں سے ملی ہیں۔ آپ ہمیں مہلت دیں ہم ملک کو جنت نشان بنا دیں گے۔''

کراچی کے حالات پر بھی علی احمد شاہد نوحہ کناں ہیں۔ ''قطرہ اک لہو کا'' میں چار افسانے اسی تناظر میں لکھے گئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں، اگرچہ یہ افسانے مختصر ہیں۔ مگر ان کا تاثر دیرپا ہے۔ سرشار صدیقی نے بڑی سچائی سے لکھا ہے۔

''میں نے ان کے افسانوں کے بین السطور میں ایک باشعور اور دردمند فن کار کے مقصد تخلیق کی جھلک بھی دیکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری طرح کھری کہانی پڑھنے کا ذوق رکھنے والے ان کے افسانوں کی داد دیں گے۔''

محمد علی صدیقی کہتے ہیں:

''اس مجموعہ کے بیشتر افسانے انسانی دکھ اور اس دکھ پر گہرے احساس ملال کے خمیر سے اٹھے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مصنف اپنے کرداروں سے خوب خوب واقف رہے ہیں''

اور تیسرے صدیقی یعنی پروفیسر ریاض صدیقی رقم طراز ہیں:

''ان کے افسانوں میں جس کرب کا اظہار ہے وہ علی احمد شاہد کا ذاتی کرب نہیں بلکہ معاشرہ کا اجتماعی کرب ہے۔ نازک سے نازک جذبہ واحساس کو وہ پورے تاثر انگیزی کے ساتھ افسانے کا رنگ دیتے ہیں''

مذکورہ تین سچے تجزیہ نگار حضرات کی آراء کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی احمد شاہد کا اپنا ایک منفرد اسلوب ترتیب پا رہا ہے اور ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ افسانوی ادب کے دربار میں ان کی نشست سب سے اونچی نہیں تو نمایاں ضرور ہوگی۔

Marfat.com

مرکزِ یقین

محترمہ شمیم شاہ کا درس و تدریس سے انسلاک ''مرکز یقین'' کی تخلیق کا باعث قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے عام فہم انداز میں نسل نو کو تاریخی شعور سے متعارف کروانے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔

اک اشارے اور حوالے سے لیا ہے کام یاں
ہے یقین اتنا سمجھ جاؤ گے تم شعری زباں

☆☆☆

واقعات اِس میں بہت ہیں ، یاد کر لینا ضرور
ہو سکے تحریک آزادی کا تم کو کچھ شعور

وہ عشق و محبت کے جھوٹے سچے افسانوں کو شعری پیکر میں ڈھال کر کچے ذہنوں کو ایکسپلائٹ بھی کر سکتی تھیں اور ناموری بھی کما سکتی تھیں، لیکن انہوں نے سستی شہرت حاصل کرنے کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ تاریخی واقعات کو بڑے سلیقے سے، تسلسل برقرار رکھتے ہوئے، خوب صورت انداز میں منظوم کرنے کا انتہائی مشکل اور دشوار ترین مرحلہ طے کر کے ایک قابل ذکر و قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

محترمہ شمیم شاہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ پاکستان کے اہم واقعات اور تاریخی شخصیتوں کو بڑے اختصار کے ساتھ ایک ایک دو دو مصرعوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ چودھری رحمت علی کی زندگی اور کارنامے چار مصرعوں میں سمٹے ہوئے ایک طویل جهد آزادی کی داستان بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

Marfat.com

کیسے بھولیں گی ہمیں رحمت علی کی خدمتیں
جو اٹھاتے آخری دم تک رہے ہیں کلفتیں

☆☆☆

نام پاکستان کی تجویز اس نے پیش کی
پمفلٹ لکھنے میں گزری زندگی درویش کی

بانی پاکستان، قائداعظم کی عظیم المرتبت شخصیت کی تصویر ان دو اشعار کے آئینے میں
دیکھیے۔

قائد اعظم ہے تاریخ کا ممتاز باب
کم سنی کے عہد سے پائی ذہانت بے حساب

☆☆☆

محنت شاقہ سے حاصل کرلیا ایسا مقام
ہر قدم پر زندگی نے ان کو بخشا ہے دوام

تاریخی حقائق کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے محترمہ شمیم شاہ کا قلم کہیں کہیں تلخ نوائی پر
بھی اتر آیا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاست کے بارے میں ان کا تجزیہ حقیقت کے کتنا قریب
ہے!

کھیلتا آزاد گر نہ سازشوں کے کھیل کو
کاٹتا کب کوئی گاڑی، لوٹتا کب ریل کو

☆☆☆

آنہیں سکتا تھا پھر پنجاب پر یہ مرحلہ!
اس طرح کی قتل و غارت کا نہ چلتا سلسلہ
ہو نہیں سکتی تھی پھر تقسیم یوں پنجاب کی

Marfat.com

بن نہیں سکتی تھی صورت پھر دلِ بے تاب لی

☆☆☆

چھوڑنے پڑتے نہ گھر اتنی بڑی تعداد کو
دیکھتی نہ آنکھ کوئی ایسے استبداد کو

☆☆☆

لٹ نہیں سکتی تھی پھر یوں عورتوں کی آبرو
چھینتا کیسے کوئی بیٹی ، بہو کو روبرو

☆☆☆

یہ بڑی گہری تھی سازش برملا آزاد کی
کوئی حد باقی نہیں تھی اس ستم ایجاد کی

محترمہ شمیم شاہ ''مرکزِ یقین'' کی تخلیق کے دوران میں جس ذہنی کرب سے گزری ہیں، وطن عزیز کی حالت زار پر جس طرح انہوں نے اشک افشانی کی ہے، اس کتاب کا ایک ایک ورق اس کی شہادت دیتا ہے۔

اس حوالے سے ان کے چند مصرعے ملاحظہ کیجئے۔

وائے ناکامی ، وطن میں آسکا نہ انقلاب

☆☆☆

پھر گروہی نفرتیں ویسی ہی ہیں میدان میں

☆☆☆

ہو گئی محروم جمہوری فضا سے پھر عوام

☆☆☆

اس چمن کی اب فضا رہنے لگی بے حد خراب

Marfat.com

اسی فضا کے چند شعر

آج بھی تو عافیت سے بے خبر ہے زندگی
آج بھی دشوار سے دشوار تر ہے زندگی

☆☆☆

زر پرستوں کا عجب کردار میرے دیس میں
سب سے بڑھ کر ہیں یہی عیار میرے دیس میں

☆☆☆

دیس کا ہیں روگ، میرے دیس کے جاگیردار
چور، ڈاکو لوگ میرے دیس کے جاگیردار

☆☆☆

فکر قومی کی کمی ہے، علم و حکمت کا فتور
اے خدا اپنے کرم سے ہم کو دے قومی شعور

''مرکز یقین'' پڑھ کر یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ محترمہ شمیم شاہ حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ حقیقت شناسی کی بھی متلاشی ہیں۔ ممکن ہے ''مرکز یقین'' کی تخلیق انہیں حقیقت شناسی کے دھارے کے قریب لے آئی ہو۔

پاکستان کی گولڈن جوبلی کے اس تاریخی موقعے پر ''مرکز یقین'' کی تخلیق و اشاعت پر محترمہ شمیم شاہ یقیناً مبارکباد کا استحقاق رکھتی ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

وقت لا وقت

''وقت لا وقت'' ستیہ پال آنند کی آزاد نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔
ستیہ پال آنند کی شعری کائنات میں جو بوقلمونی، رنگارنگی اور کشادہ نظری ہے، وہ اس کا مختلف ممالک سے انسلاک، وابستگی پانا تا ہی نہیں بلکہ اس کی اپنی ذات کے اندر سے پھوٹنے والے فکرو احساس کے چشموں کی جل ترنگ بھی ہے۔فکر واحساس کی یہی دل افروز نمو معاصر شعری منظر نامے پر سیتہ پال آنند کے نام کو نمایاں کرنے کا ایک معتبر ذریعہ ہے۔
عصری سچائیوں کو شعری پیکرون میں ڈھالنا، ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں، لیکن ستیہ پال آنند نے اس مشکل مرحلے کو نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔اس کی نظم کی نادرہ کاری، بے ساختگی اور جدت طرازی، جدید نظم نگاروں کے ہجوم میں اس کے نام کا پرچم بلند رکھے گی۔
ستیہ پال آنند یقیناً اس حقیقت کا ادارک رکھتا ہے کہ شکوک وشبہات کی فضا نئے عالمی تہذیبی رویوں کی دین ہے۔خوف و ہراس عہد حاضر کے انسان کا اجتماعی مقدر ہے۔شکوک و شبہات کی اس غیر یقینی فضا نے سارے عالمی معاشرے کو اپنے آہنی پنجوں کی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ہمارے دور کے تخلیق کاروں کے ذہنوں پر اس کا اثر انداز ہونا ایک لازمی امر ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ ان کا اپنے اردگرد پر ہی سے نہیں بلکہ اپنی ذات پر سے بھی اعتماد ختم ہو چکا ہے۔خوف نے کچھ ایسا گھیراؤ کیا ہے کہ ہر انسان نے اپنے چارسو فکروں کے حصار کھینچ لیے ہیں اور یوں اپنی ہی ذات کا زندانی بن کر رہ گیا ہے۔
معاشرتی بے چینی، اقدار کا زوال، مہر ومحبت کا کال اور نفرتوں کا جال کچھ ایسے پھیل گیا ہے کہ ستیہ پال آنند اپنی نظم ''مویشی منڈی'' میں یہ کہنے پر مجبور ہے۔

Marfat.com

لفظ اڑتے، پھسلتے، بے معنی ومقصد، ابلتا

شور، دھیمی بات، زیرلب کسی کا ہنہنانا

''اور پھراس نے کہا، میں نے نہیں پوچھا کہ وہ تو

چاپلوسی کرر ہاتھا'' ہاں بڑا عیار ہے وہ بچ کے رہنا!'' دوڑتی پھرتی ہے۔ چج می ناٹ ہے وہ''

''نمبھ جیسی، ہاتھ سے پھسلی تو بس سمجھو کہ کھودی!''

ہاں، اگر پیسہ لگائیں گے تو دگنا ہو ہی جائے گا، سمجھ لو!''

''منتری جی کو بلاؤ''

''بریف کیسوں میں کرنسی نوٹ بھر دو!''

''آج جب ٹینڈر کھلا تو

سب حریفوں نے صف ماتم بچھالی، رو رہے تھے!''

''کون وہ شاعر، جو کونے میں کھڑا ہے؟''

''گا نہیں سکتا، بھلا سا نام کیا ہے؟''

ستیہ پال آنند ہوگا''

کارڈ ٹیبل پر چلیں، دو بازیاں ہو جائیں''

بک بک

اور بک بک

اور بک بک

یہ مویشی کون ہیں؟ اور کون سی منڈی ہے یہ؟ (مویشی منڈی)

ستیہ پال آنند کی نظموں میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ پیکر تراشی کے خوب صورت انداز بھی قابل دید ہیں' سنواسکیپ کی یہ لائنیں دیکھئے۔

اور وہ لمحے گذشتہ موسم گرما سے میرے

Marfat.com

ذہن کے گنبد میں جو سوئے ہوئے تھے

چونک کر جاگے تھے، گرتی برف میں دوڑے تھے باہر

برف کے ننھے سے گھنگرو باندھ کر ناچے تھے، اب پھر منجمد، برفیلے خوابوں کے سنو

اسکیپ میں گم راستوں پر ایستادہ

میل پتھر بن گئے ہیں، سو گئے ہیں

بل راج کومل نے ''وقت لا وقت'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''ہر شاعر کے ہاں زندگی کے تجربات کا ایک ترجیحی دائرہ انتخاب ہوتا ہے، اور اس کے تئیں ردِ عمل کا ترجیحی اظہار کا رنگ ستیہ پال آنند کی تازہ نظموں میں شعری ردِ عمل دو ترجیحی دائروں میں سفر کرتا ہے، انسانی زندگی کی عصری صورت حال اور اس کے تعلق سے فنکارانہ ردِ عمل اور اس کا اظہار ستیہ پال کی بہت سی اہم نظموں میں بطور محرک اور بطور نقطہ تکمیل منظر نامہ تیار کرتے ہیں، بعض اوقات معروضی انداز سے، بعض اوقات ذہنی طور پر وخیل تماشائی کے انداز میں لیکن بہر حال یہ منظر نامہ محض منظر نامہ ہو کر نہیں رہ جاتا۔ منزل سفر پر شاعر کی بصیرت اسے ایسی غیر جسمانی جہتیں عطا کر دیتی ہے جو گنجلک انداز میں مابعد الطبیعاتی نہ ہوتے ہوئے بھی متنوع معنیاتی کیفیات کی کفیل ثابت ہوتی ہے''

''وقت لا وقت'' میں ساٹھ نظمیں متنوع رنگوں کے کینوس پر پھیلی ہوئی ہیں اور نو نظمیں تتھا گت (بدھ) سے مکالماتی اور استفساراتی انداز کا ایک نیا ذائقہ لیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نظم ''ذاتی فیصلہ'' کی یہ چند لائنیں پڑھیے:

آپ سے کچھ پوچھنا ہے

آؤ پوچھو

وہ نگر کی نرتکی ہے

وہ مجھے کہتی ہے، میرے پاس آؤ

Marfat.com

بول آنند

کام سے اور واسنا سے

آپ نے بھگوان کیسے۔۔۔۔؟

اپنے استفسار پر مت ہچکچاؤ

مجھ سے ان لفظوں میں پوچھو

اک یشودھا چھوڑ دینے سے تتھاگت

آپ کو کیا جنس کی خواہش سے چھٹکارا ملا تھا؟

ہاں تتھاگت پوچھتا ہوں

بدھ آنکھیں موند کر انتر جگت میں جا براجے

چند لمحے غرق رہ کر

پھر ابھر آئے، کہا میں خود، یشودھا اور بچہ جانے کتنی ان گنت صدیوں تلک جکڑے ہوئے تھے آپسی بندھن ہمارا ایک ایسا جال تھا، جس سے نکلنا میرا بندھن توڑنا، ان سے بچھڑنا میرا پہلا کام تھا، نروان کے رستے پہ پہلا پاؤں آگے۔۔۔۔۔

ہاں تتھاگت سن رہا ہوں

جنس کی خواہش کسی مخصوص عورت کیلئے ہو

کوئی اک عورت ہو جس سے

منسلک ہو کر تمہاری عمر گزرے

واسنا تو ہے مگر یہ واسنا ایسی ہے جس سے

کوئی چھٹکارا نہیں ہے! (ذاتی فیصلہ)

زوال عمر کے تلخ احساس کی بازگشت ستیہ پال آنند کی بیشتر نظموں میں واضح طور پر سنائی دیتی ہے اور کئی نظموں میں زیریں لہر کی صورت میں رواں دواں ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے اور اس

Marfat.com

عمر کے سچے تخلیق کاروں کی تخلیقات کا ایک لازمی عنصر ہے:

شہر میں لوٹا تو ہوں، لیکن سبھی سے پوچھتا ہوں
شہر میں شہرِ خموشاں کس جگہ ہے؟
کس جگہ پر میرا ماضی دفن ہے، کتبے کہاں ہیں؟
جن پہ میرا نام اور تاریخ لکھی ہے، مہینوں اور دنوں میں

(شہر میں شہرِ خموشاں)

''وقت لاوقت'' کا انتساب مراقش کی شاعرہ عائشہ الجدید کے نام ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

پرتو غالب

ان کے اصل نام کے بارے، میں تو بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔ وہ "نواب صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔ گورا چٹا رنگ، چھریرا بدن، ستواں ناک، آنکھوں میں طلسماتی چمک، زبان میں طراری، ڈاڑھی مونچھ صاف، میانہ قد، کھلے گھیر کا پاجامہ اور بوسکی کی قمیص، ان کا عام لباس اور سردیوں میں اسی پر ایک جرسی یا بند گلے کا کوٹ پہنتے تھے۔ طبعیت میں بے چینی اور سیمابیت کی کیفیت تھی۔ چالیس پنتالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ مدتوں بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ان کا اصل نام نواب افتخار احمد خان تھا۔ بڑی شفاف اور نستعلیق اردو بولتے تھے اور محفل پر چھا جانے کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔

ہزاروں متاثر کن اشعار ہی نہیں، اساتذہ کی پوری کی پوری غزلیں انہیں از بر تھیں۔ ان کے شعر پڑھنے کے انداز میں ایسی سحر طرازی، والہیت اور کیفیت تھی کہ سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جائیں۔

نواب صاحب خود شعر کہتے تھے یا نہیں؟ اس کا انہوں نے کبھی اظہار ہی نہیں کیا۔ 1957-58ء میں جب ہم ہائی اسکول کے طالب علم تھے، وہ شام کے وقت ہماری محفل میں آجاتے اور رات گئے تک انہی کی زبان چلتی اور ہم چار پانچ دوست، ہمہ تن گوش، بھلے مانس، اچھے سامعین کی حیثیت سے ان کی گفتگو کے ذائقے کا لطف اٹھاتے۔

ایک دن نواب صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔

ایران سے ملا عبدالصمد ہندوستان آئے تو گھومتے گھماتے آگرے بھی گئے۔ میر تقی میر کا ان دنوں بڑا شہرہ تھا۔ ملا عبدالصمد کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میر صاحب کے نیاز حاصل کریں۔ وہ

Marfat.com

تلاش کرتے ہوئے ایک محلے کے قریب پہنچے، جہاں چند لڑکے کھیل کود میں مصروف تھے۔ انہوں نے کہا۔

بیٹو! مجھے میر تقی میر سے ملنا ہے۔

ایک لڑکا جس کی عمر آٹھ دس سال ہوگی۔ آگے بڑھا اور کہا ''بڑے میاں! آپ یہاں سے سیدھے جائیں۔ پھر دائیں ہاتھ مڑیں۔ پھر سیدھے چلتے رہیں۔ پھر بائیں ہاتھ مڑ کر تھوڑی دور چلنے کے بعد دائیں جانب مڑ جائیں۔ تھوڑا چلنے کے بعد آپ پھر بائیں جانب ہو جائیں اور چند قدم اور چلیں گے تو میر صاحب کا مکان آ جائے گا۔

ملا عبدالصمد نے اس بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''بیٹے! آپ مجھے کن بھول بھلیوں میں ڈال رہے ہیں۔ میں یہاں اجنبی ہوں اگر آپ کے کھیل کا حرج نہ ہو تو میری راہنمائی کیجئے۔ وہاں تک میرے ساتھ چلئے''

وہ لڑکا بڑی سعادت مندی سے ملا عبدالصمد کے آگے آگے بڑے پر وقار انداز سے چل پڑا۔ میر صاحب کے دروازے پر دستک دی اور اندر پیغام بھجوایا کہ ملا عبدالصمد آپ سے ملنے، ایران سے تشریف لائے ہیں۔ میر صاحب بیٹھک میں ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اٹھ تو نہ سکے۔ غنودہ آواز میں یہ مصرع پڑھا۔

کس کی نگاہ مل گئی کس کی نگاہ سے

وہ لڑکا فوراً بول پڑا

''بڑے میاں! ایسے نہیں، اسے یوں پڑھیے۔

طوفان بجلیوں کا اٹھا جلوہ گاہ سے
کس کی نگاہ مل گئی کس کی نگاہ سے

میر تقی میر نے محبت سے اس بچے کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔

''واللہ! ہندوستان میں پہلے پونے دو شاعر تھے (ایک خود میر تقی میر۔ آدھے، مرزا سودا اور پاؤ بھر

Marfat.com

خواجہ میر درد) اب ساڑھے تین ہو گئے ہیں۔ ہم تینوں کے برابر یہ اکیلا شاعر بچہ ہے۔'' میر صاحب نے پوچھا

''بیٹے تمہارا نام کیا ہے؟''

بچے نے متانت سے جواب دیا۔''اسد اللہ خان''

''باپ کا نام؟''

''عبداللہ بیگ خان''

میر تقی میر نے ملا عبدالصمد سے کہا کہ اس بچہ کی تربیت کیجئے۔ یہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ چنانچہ ملا عبدالصمد مرزا اسد اللہ خان کے گھر دو سال رہے اور مرزا نے ان سے فارسی زبان کے رموز و نکات سیکھے۔ میر تقی میر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور مرزا غالب نام آور ہوئے۔

نواب صاحب دیگر اساتذہ کے کلام کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کی غزلیں بھی بڑے دل نشیں انداز میں تحت اللفظ سنایا کرتے تھے۔ میں بیشتر اشعار اور غزلیں ڈائری میں نوٹ کر لیتا تھا۔ غالب کی دیگر غزلیں تو دیوان میں مل گئیں لیکن ایک غزل دیوان غالب کے کسی بھی ایڈیشن میں نہیں ملی۔ میں نے یہ غزل ماہنامہ ''محفل'' لاہور میں اس غرض سے شائع کروائی کہ شاید غالب شناس کوئی صاحب اس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں گے۔ لگتا ہے کہ یہ غزل نواب صاحب کی کاوش قلم کا خوب صورت ثمر ہے۔

ملنے پہ بھی دل ناخوش و ناشاد بہت ہے
فرقت میں تری خوگر بے داد بہت ہے
میں کشمکش چارہ وحشت کا ہوں طالب
وہ رشک [illegible] ولے جلاد بہت ہے
افسردگی کوچہ و بازار کا ماتم
دل [illegible] پوچھو کہ یہ برباد بہت ہے

Marfat.com

وہ ضعف کہ ہے مانع نظارہ نرگس
وہ شوخ بہر رنگ ستم ایجاد بہت ہے
اب حسرت دیدار ہے اک خواب پریشاں
دل رنج و غم دہر سے آباد بہت ہے
اب طعنہ اغیار کا شکوہ نہیں غالب
ہر چند ابھی طاقت فریاد بہت ہے 1

غالب سے بے سرو پا لطائف و واقعات تو منسوب ہو ہی رہے تھے۔ یار لوگوں نے غالب کے رنگ میں غزلیں کہہ کر بھی شائع کروانا شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالباری آسی نے تو کمال ہی کر دیا۔ مولانا آسی مرحوم لکھنو کے ادبی حلقوں، بالخصوص نوجوانوں میں "نیک نام" تھے کہ وہ غالب کے نام سے خود غزلیں کہہ کے سناتے ہیں۔ مولانا آسی جب کسی محفل میں جاتے تو لوگ شرارتاً پوچھتے۔ "کہیے مولانا! غالب کا کوئی "تازہ کلام" دستیاب ہوا؟" مولانا اپنی انا کی تسکین "غالب کا تازہ کلام" سنا کر کرتے! انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ ڈاکٹر عظمت الٰہی نسلونوی ایڈیٹر اخبار "قیامت" کے پاس ایک پرانی بیاض ہے۔ جس میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام ہے۔ یہ سب مولانا آسی کا اپنا کارنامہ تھا۔

"مولانا آسی نے غالب کے اردو کلام میں الحاقی کلام تو شامل کیا ہی تھا۔ سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ 1925 میں دیوان غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن نول کشور پریس لکھنو سے شائع کریا۔ جس میں ایک طرف تو نسخہ حمیدیہ (مکتوبہ 1821ء مطبوعہ 1921ء) کا ایک انتخاب بھی "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم" کے عنوان سے شامل کر دیا اور نسخہ حمیدیہ کے حوالے کے بغیر تحریر فرمایا"۔(2)

"چونکہ مرزا غالب کی غیر مطبوعہ غزلیں یا وہ کلام جسے غالب نے خود قابل طبع نہ سمجھا تھا۔ اکثر بیدل

Marfat.com

شوکت اور اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اس وجہ سے وہ بے حد الجھی ہوئی اور بعید الفہم ہیں، لہذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں جو اس رنگ میں بے حد سہل اور آسان ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کر دیا جائے۔ مگر چونکہ خود مرزا غالب نے ان کو علیحدہ کر دیا ہے، لہذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا۔" (3)

مولانا آسی نے "مکمل شرح دیوان غالب" (مطبوعہ 1931ء) میں مرزا غالب کی غزلوں میں بہت سے شعر خود کہہ کر شامل کر دیئے ہیں جو دیوان غالب کے کسی بھی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ مرزا غالب کا رنگ سخن نہیں، تاہم مماثلت کافی حد تک پائی جاتی ہے، بالخصوص جو عام فہم اشعار ہیں۔

مستقل مرکز غم پر بھی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازہ آئین وفا ہو جاتا
دشت وحشت ہے مرا خشت بدیوار فنا
گر فنا بھی میں نہ ہوتا تو فنا ہو جاتا
حسرت اندوزی ارباب حقیقت مت پوچھ
جلوہ اک روز تو آئینہ نما ہو جاتا!
دشت وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گرد جولان جنوں تک بھی پکارا ہم کو
عجز ہی اصل میں تھا حاصل صد رنگ عروج
ذوق پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو
ضعف مشغول ہے پیکار بہ سعی بے جا
کر چکا جوش جنوں اب تو اشارا ہم کو
صور محشر کی صدا میں ہے فسونِ امید

Marfat.com

خواہش زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو
تختۂ گور، سفینے کے مماثل ہے اسد
بحر غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستان کے ہوا داروں کا

بدتر از ویرانہ ہے فصل خزاں میں صحن باغ
خانہ بلبل بغیر از خندہ گل بے چراغ

وضع نیرنگی آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

نمائش پردہ دار طرز بیداد تغافل ہے
تسلی جان بلبل کے لئے خند یدنِ گل ہے

ہم سے خوبان جہان پہلو تہی کرتے رہے
ہم ہمیشہ مشقِ ازل خود رنگی کرتے رہے

کس کی برق شوخی رفتار کا دل دادہ ہے
ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے

اس جور و جفا پر بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے!

Marfat.com

درد ہو دل میں تو دوا کیجیے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے 4

بھوپال والی غزل جسے مالک رام نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن میں "ہمایوں" (لاہور) سے نقل کر کے شامل اشاعت کیا تھا، کے بارے میں جب نادم ستیاپوری اور مالک رام وغیرہ نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ یہ غزل بھوپال کے مولوی محمد ابراہیم خلیل کا نتیجہ فکر ہے، جسے انہوں نے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ "گوہر تعلیم" (اپریل 1937ء) میں شائع کیا تھا۔ غزل پر عنوان تھا "اپریل فول"۔

بھوپال کے جوہر قریشی نے اس غزل کو "دین ودنیا" دہلی میں غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے حوالے سے شائع کروایا۔ پھر "ہمایوں" لاہور (اپریل 1939ء) میں یہ نقل ہوئی۔ اس غزل کو خواجہ حسن نظامی نے "منادی" دہلی میں بھی شائع فرمایا تھا۔

بھولے سے کاش! وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو
تا گردش فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشم مست ہو اور دور جام ہو
بیتاب ہوں بلا سے، کن انکھوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہو، حریم ہے، محرم ہے رازدار
میں سربکف ہوں، تیغ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھورلوں کبھی
پھر شوخ دیدہ برسر صد انتقام ہو

Marfat.com

وہ دن کہاں کہ حرف تمنا ہو روشناس
ناکام بدنصیب کبھی شادکام ہو
گھس مل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزم غیر ہی میں ہوں پر اژدحام ہو
اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں
مجھ پر جو چشم ساقی بیت الحرام ہو
پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو 5

چمن بے نظیر (مطبوعہ 1892ء) میں غالب کے نام سے تین غزلیں اشاعت پذیر ہوئی تھیں۔ جو دیوان غالب میں شامل نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے، بہت سے نابغہ روزگار شاعر حضرات نے غالب کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈبولیا ہے! اگر چہ وہ یہ روش چھوڑ کر اپنے ہی رنگ میں شاعری فرماتے تو ان کا اپنا رنگ بھی یقیناً چوکھا ہوتا۔ غزلیں دیکھئے غالب ہی کا رنگ سخن نظر آئے گا۔

کب رہا ہے اب ہمیں مور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا تجھ کو نظر کا امتیاز
اوس کا کوچہ چھوڑ کر جاوے ہے گلشن کی طرف
ہو گیا معلوم بس باد سحر کا امتیاز
نازکی جس نے رگِ گل کی نہ دیکھی ہو کبھی
ہو میاں کیونکر اسے تیری کمر کا امتیاز
ہے یہ سودائے محبت ہے کہ یاں اس بات کو
کچھ نہیں رہتا جہاں نفع و ضرر کا امتیاز

Marfat.com

جب نشست اغیار کے پہلو میں ٹھہری یار کی
تب ہمارا رہ گیا واں پھر کدھر کا امتیاز
اہل ہمت بوجھتے ہیں خاک جب اکسیر کو
ان کو کب ہوتا ہے صرف سیم وزر کا امتیاز
آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں
ورنہ ہے کس کے اسے عیب و ہنر کا امتیاز 6

ہیگا جو ناز و ادا اوس بت لاثانی میں
ایک بھی بات نہ تھی یوسف کنعانی میں
عشق میں دیتا ہوں اوس لیلیٰ کے کاوش جاں کو
دست رس ہے یہ کہاں قیس بیابانی میں
چرخ نے پنبہ مہتاب کو کانوں میں دیا
شوریاں تک ہے مرے اشک کی طغیانی میں
جان مردوں کی پھرے لب سے جو نکلے دشنام
کیا مسیحائی ہے اس لعل بدخشانی میں
کار شمشیر کا کرتا ہے خیال ابرو
داغ اس کا ہے ازل سے میری پیشانی میں
پہن کر ہووے گا خوش شال دو شالہ کوئی
ہم بھی ہیں شاد اے غالب اسی عریانی میں ! 7

Marfat.com

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکوہ سمجھو یا اسے کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
ہے سویدا بھی سیہ پوش و عزا داری دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمن جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
مین تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش میں در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں 8

جن شعرا حضرات نے غالب کے رنگ کی پیروی کی ہے، وہ اس رنگ کی حد تک تو کامیاب ہیں، لیکن غالب کے اسلوب خاص میں جو تہہ داری اور خیال آفرینی ہے وہ ان کے یہاں مفقود ہے۔

''اور کسی کا کیا ذکر شاعر مشرق علامہ اقبال نے بھی غالب سے بہت استفادہ کیا ہے اور ان کی بیشتر فارسی تراکیب اور تشبیہات سے غالب کا انداز بیان جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر

Marfat.com

ہی غالب کے انداز بیان کی نشاندہی کرتا ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستان میری

خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زبان میری۔'' 9

''بریلی میں ایک نوجوان شاعر اعتماد الدین عرش تھے۔ وہ بھی غالب کے رنگ میں خوب کہتے تھے۔ عین نوجوانی شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی ایک مکمل دیوان اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

بندگی کا تو حق ادا نہ ہوا

خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

حسن کا اعتبار اور بڑھا

میں جو شرمندہ وفا نہ ہوا

لوٹتا کیوں نہیں عدم سے کوئی

کچھ کسی کی خبر نہیں آتی

ہر قدم پر رہ محبت میں

سجدہ نقش پا کیا میں نے 10

سلیمان اویسی نے پورے دیوان غالب کی غزلوں پر ہم طرح غزلیں کہیں اور'' شان غزل'' کے نام سے مجموعہ جس میں دیوان غالب بھی شامل ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی پر دنیائے ادب کو دیا۔ کسی زمانے میں ریاض خیر آبادی نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ جسے ان کے والد نے یہ کہہ کر ضائع کروا دیا کہ تم اپنا کوئی الگ اسلوب اختیار کرو۔ لیجئے سلیمان اویسی کی ایک غزل کا لطف اٹھایئے۔

خوابیدہ سبزہ کی طرح بے خود دیدہ ہوں

زحمت کشیدہ ہوں میں نہ راحت رسیدہ ہوں

Marfat.com

زیں پیشتر کہ خم ہو یہ گردن بہ پیشِ غیر
اے ربِ کعبہ شکر کہ گردن بریدہ ہوں
برقاب ہو کہ چائے ہو جو بھی ہو جلد ہو
ساقی میں سرد و گرمِ زمانہ چشیدہ ہوں
بت ساز ہوں نہ بت کدہ، بت ہوں نہ برہمن
نازاں خدا ہے جس پہ وہ ناز آفریدہ ہوں
بلبل تو گل پہ نالاں ہے، شمع پتنگ پر
میں شبنم چمن کے لئے آب دیدہ ہوں
پوچھی کبھی انہوں نے نہ بھولے سے میری بات
گویا میں دوستوں کیلئے آفریدہ ہوں !
اے شمع شب بخیر، اے پروانہ، دم بخیر
میں گلشن فنا میں سپند تپیدہ ہوں
نذر ادب، سلیمان ہے یہ مختصر غزل
11 ورنہ میں فکر شعر سے دامن کشیدہ ہوں

آخر میں سلیم اختر فارانی کی غالب کے رنگ میں رنگی غزل پڑھیے۔

بیان شعر میں راس آ گیا غالب کا رنگ آخر
بآب بادہ کہنہ دھلا سینے کا زنگ آخر
فشار خون سے کیوں کہ نمود قوت دل ہو
بدلتے جا رہے ہیں دیکھئے بسمل کے ڈھنگ آخر
وہ ہیں گر خانہ زاد خوئے ترکان جفا پرور
تو ہم بھی آج ہوتے ہیں کمر بستہ بجنگ آخر

Marfat.com

سخن گوئی زجاج طبع نازک پر گراں گزری
شکستہ ہو گیا دیکھو حریف ضرب سنگ آخر
بظاہر دل کش و خوش رنگ آتی ہے نظر ہم کو
نہ بھولو، لے ہی ڈوبے گی یہ تقلید فرنگ آخر
مشام عطر پیراہن ، نگاہ جلوہ بیں اختر
یہی تھا مایہ وحشت جو لایا اپنا رنگ آخر 12

اخذ و استفادہ

۱۔ ماہنامہ ''محفل'' لاہور اگست 1990

۲۔ ''خیابان غالب'' نادم سیتاپوری مطبوعہ 1970ء مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی صفحہ نمبر 118

۳۔ ''دیوان غالب'' ایڈیشن 1925ء بحوالہ ''خیابان غالب'' صفحہ نمبر 115

۴۔ ''فروغ اردو'' لکھنو غالب نمبر'' غالب کے کلام میں الحاقی عناصر'' ڈاکٹر وصی احمد

۵۔ ''خیابان غالب'' نادم سیتاپوری صفحہ نمبر 90-189

۶۔ ''چمن بے نظیر'' مطبع محمدی، بمبئی مطبوعہ فروری 1892 صفحہ نمبر 103

۷۔ ''چمن بے نظیر'' صفحہ نمبر 156

۸۔ ''چمن بے نظیر'' صفحہ نمبر 47-246

۹۔ ''باقیاتِ غالب'' اثر فاضلی، اگست 1991ء ادارہ فکر و نظر کراچی صفحہ نمبر 28

۱۰۔ ''باقیات غالب'' صفحہ نمبر 27

۱۱۔ ''شان غزل'' سلیمان اویسی جولائی 1969ء علمی کتاب خانہ لاہور صفحہ نمبر 77

۱۲۔ بیاض، سلیم اختر فارانی (علیگ)

Marfat.com

گنج ہائے گراں مایہ

مرزا غالب کے بعد رشید احمد صدیقی کو یہ اعزاز و کمال حاصل ہے کہ ان کی رسیلی اور بے شکن نثر پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور جب کوئی قاری ان کا کوئی سا بھی مضمون شروع کرے اور پڑھ کر ختم نہ کرے یہ گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے صدیقی صاحب اپنے قاری پر سحر طاری کر دیتے ہیں۔

''گنج ہائے گراں مایہ'' رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جیسے مہر الٰہی ندیم (ملیگ) اور لطیف الزماں خان نے بڑی تلاش و جستجو سے یک جا کر کے ترتیب دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لطیف الزماں خاں کا دوسرا عشق رشید احمد صدیقی سے ہے اور اس عاشقی کو وہ کامیابی سے نبھا رہے ہیں۔ یہ کام ایک ادارے کا ہے جو خاں صاحب مہر الٰہی ندیم کی معاونت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی نادر و نایاب تحریروں کی تلاش اور انہیں کتابی صورت میں پیش کرنا، آسان کام نہیں۔

پیش نظر مجموعے میں سولہ خاکے ہیں۔ ان میں سے تین خاکے جگر مرادآبادی، (تری یاد کا عالم) بابائے اردو اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین پہلے حصے میں بھی شامل ہیں۔ خاکہ نگاری کو یار لوگوں نے ایک آسان صنف سمجھ رکھا ہے۔ حالاں کہ یہ مشکل ترین فن ہے۔ وہ دوسروں کی پگڑی اچھالنے اور شخصیت کے کمزور پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کو خاکہ نگاری گردانتے ہیں۔ ہمیں ایسے خاکے پڑھنے اور سننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے کہ جیسے ہجوم میں شخصیت کے کپڑے اتار دیے ہوں۔

لطیف الزماں خاں اپنی معروضیات میں رقم طراز ہیں:

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رشید صاحب کی فکر میں وہ تبدیلی آئی جس میں شخص کی

Marfat.com

خوبیاں ہی اہم ہوتی ہیں۔علی گڑھ یا اردو کی ایسی شخصیات جن کی زندگی میں کہیں ریاکاری اور مکاری کا کوئی مقام نہ تھا جو بے لوث خدمت ہی کو زندگی جانتے تھے۔ وہ لوگ جنہیں ملک،قوم، افراد اور اداروں سے محبت تھی جو غیور و خود شناس تھے۔ جو عالی ظرفی اور بلند نظری میں آپ اپنی مثال تھے جو انکساری اور شرافت کو کسی قیمت پر چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے،رشید صاحب کی توجہ کا مرکز بنتے چلے گئے اور جب وہ اس جہانِ فانی سے اٹھ گئے تو رشید صاحب کے قلم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔''

''گنج ہائے گراں مایہ'' کے یوں تو سبھی خاکے قابل مطالعہ ہیں لیکن مولانا سہیل، حسرت موہانی، قاضی عزیز الدین بلگرامی، ذاکر صاحب، پطرس بخاری، اثر لکھنوی، دیوانہ گورکھ پوری، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے خاکے خصوصی توجہ اور انہماک کے طالب ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے اندازِ تحریر میں جو ژرف نگاہی ہے وہ صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ الفاظ کا ․․․ بست ایسا کہ جیسے مرصع غزل کے بولتے ہوئے مصرعے۔مولانا سہیل کے خاکے کا آغاز دیکھئے:

''مولانا سہیل (اقبال احمد خان ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی ملیگ) سے میری ملاقات 1915ء میں ہوئی،اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے،یونین کے الیکشن لڑاتے تھے۔اب مقدمے لڑاتے اور بچے پیدا کرتے ہیں''۔

رشید احمد صدیقی نے حسرت کے خاکے میں لکھا ہے:

''غزل میں ثواب کمانے کا مشغلہ میں کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتا۔شاعری کرنی ہے تو شاعری کا حق ادا کرنا پڑے گا چاہے ثواب کا مقصد پورا ہو یا نہ ہو۔حسرت نے نعت اور منقبت بھی لکھی ہے لیکن ان کی شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں۔نعت لکھنا معمولی بات نہیں ہے۔مولود خوانوں اور قوالوں کیلئے نعت لکھ دینا تو آسان ہے لیکن حضورؐ آیہ رحمت میں لب کشائی، آسان نہیں۔شرف و سعادت کی یہ متاعِ گراں مایہ حالی اور اقبال کے حصہ میں آئی اور ہمارے ہی کیا،

Marfat.com

دوسرے شعروادب میں بھی حالی اور اقبال روز روز پیدا نہیں ہوتے۔''

رشید صاحب نے کس خوب صورتی سے بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ آج جو نعت کہی جارہی ہے، اس سے نعت کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج بہت سے شعراء نظریہ ضرورت کے تحت نعت کہہ رہے ہیں۔کئی شعراء ایسے بھی ہیں جو تمام عمر اشترا کی نظریات کی تبلیغ کرتے رہے اور آج ریڈیو اور ٹی وی کے موسمی مشاعروں میں شامل ہونے کیلئے اور چار پیسے کمانے کیلئے نعت کہہ رہے ہیں۔ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا سرمایہ ایک آدھ نعت ہی ہے اور وہ ہر نعتیہ مشاعرے میں ہر بار یہی ایک نعت پڑھتے ہیں۔

لطیف الزماں خاں نے ''معروضات'' میں رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کے حوالے سے جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔

''رشید صاحب نے خاکہ لکھتے وقت اپنی پوری توجہ شخص کی خوبیوں پر رکھی جو خط وخال بنائے وہ ویسے ہی ہیں جیسے وہ لوگ تھے۔ان کے چہروں پر رشید صاحب نے غازہ نہیں ملا۔ان حرکات وسکنات کی تلاش وجستجو میں وقت ضائع نہیں کیا جن کی ''شرفائے ادب'' کے نزدیک کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ان کے خاکوں میں دیانت اور راستی ملے گی، شباب ونشاط کی جھوٹی کہانیاں نہیں ملیں گی۔صداقت وخلوص ملے گا، ریاکاری اور مکاری کا یہاں گذر نہیں۔دانش آگاہی ملے گی، خود پرستی نہیں، جذبہ محبت اور وجدان تو ملے گا، اخلاقی اقدار کی پامالی اور زبوں حالی نہ ملے گی۔ معاشرت اور تہذیب کا ذکر تو ملے گا لیکن کوتاہ اندیشی اور کم نگہی نہ ملے گی۔قلب ونظر کی وسعت ملے گی، تنگ خیالی اور تہی ظرفی نہیں''۔

''گنج ہائے گراں مایہ'' کا پیش لفظ پروفیسر مسعود حسین نے بڑے عالمانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

جادۂ شوق ومحبت

''جادۂ شوق ومحبت'' شاکر کنڈان کا حجاز مقدس کا جمال آفرین سفر نامہ ہے۔انہوں نے ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں چند سال گزارے حج کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے اور عمرے ادا کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔وہ اس سرزمین پاک پر جہاں بھی گئے، کھلی آنکھوں سے گئے اور ہر ایک جگہ کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات کی دولت اپنے ساتھ لائے'' جادۂ شوق ومحبت'' لکھ کر شاکر کنڈان نے تاریخ اور جغرافیے کی بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

شاکر کنڈان کا بنیادی حوالہ ایک شاعر کا ہے۔انہوں نے اس سفر نامے میں اپنے منفرد شاعرانہ اسلوب سے خوب خوب کام لیا ہے اور ہر صفحے پر موقع محل کے مطابق انہوں نے اشعار کا ایک خوب صورت انتخاب پیش کر کے انبساط و بہجت کا ایمان افروز سامان اپنے قاری کے دامن میں ڈال کر دوہری سعادت حاصل کی ہے۔یہ شاکر کنڈان کا دل نشین اسلوب نگارش ہے کہ'' جادۂ شوق ومحبت'' کا قاری'' جادۂ شوق ومحبت'' میں اپنے آپ کو گم پاتا ہے۔ان کے لمحات مسرت اور شادمانی میں پڑھنے والے بھی خود بخود شامل ہو جاتے ہیں۔

دیارِ حبیبؐ میں حبیبؐ خدا کا ذکر، صحابہ کرامؓ کا ذکر، مساجد کا ذکر، غاروں کا پہاڑوں کا ذکر، جنگ کے میدانوں کا ذکر، شہدا کا ذکر، شہروں اور قصبوں کا ذکر، گلیوں اور بازاروں کا ذکر، مکینوں اور مکانوں کا ذکر، گزرے زمانوں کا ذکر، کھنڈرات کا ذکر

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں ماحول
اتنا خاموش ہے ، فریاد کناں ہو جیسے

☆☆☆

Marfat.com

ان پہاڑوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روح تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

شاکر کنڈان کا قلم ایک مورخ یا سفرنامہ نگار کا قلم ہی نہیں بلکہ ایک تجزیہ نگار کا انداز بھی رکھتا ہے وہ بتاتے ہیں:

''کئی موڑ مڑنے اور تاریخ کی کڑیاں ملانے کے بعد میں نے جب نگاہ اٹھائی تو سامنے ایک قصبہ پایا، جس کے نام کا تختہ سڑک کے کنارے ''ابیارعلی'' لکھا موجود تھا۔ راستے میں ہمیں کئی ایسی بستیاں بھی نظر آئیں جن میں کچھ مکان اور کھجوروں کے باغ تو موجود تھے لیکن آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کی آبادی کس تیز رفتاری سے گاؤں چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے''

شاکر کنڈان نے سرزمین حجاز میں جو سفر وقت بے وقت کیے تھے ان کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کر کے ایک خوب صورت سفرنامہ پڑھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ شاکر کنڈان نے تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی ہی نہیں بلکہ موجودہ سعودی عرب کا حال احوال بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ پڑھنے والے اس کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر ہر مقام کی سیر کرتے چلے جاتے ہیں۔

سفرنامے تو اور بھی بے شمار لکھے گئے ہیں لیکن جس محبت، محنت، دل جمعی اور لگن کے ساتھ ''جادۂ شوق ومحبت'' لکھا گیا ہے۔ اس کی مثال کم کم ہی نظر آئے گی۔ اس سفرنامے میں شاکر کنڈان نے صدیوں کے سفر کو لمحوں میں سمیٹ کر اپنے مشاہدے کی گہرائی باریک بینی اور تیز رفتاری کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ شاکر کنڈان ہمیں ایک زیرک سیاح کے روپ میں تو نظر آتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک درویش صفت اللہ لوک بھی ہے۔

شاکر کنڈان جہاں کہیں اپنے مشاہدے کی کمندیں پھینکتا ہے، وہ اپنے ساتھ بڑے حسین مناظر بھی کھینچ لاتا ہے۔ جب تک ''جادۂ شوق ومحبت'' ہاتھ میں رہتی ہے، پڑھنے والے اسی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں اور اس دنیا سے واپس آنا، ان کے بس کا روگ نہیں۔

Marfat.com

شاکر کنڈان جب مسجد الحرام کے دروازے پر پہنچتا ہے تو وہ ایک دروازے کا نہیں بلکہ پچاس دروازوں کے نام اوران کی مختصر تاریخ بھی حیطہ تحریر میں لے آتا ہے۔ چند دروازوں کے نام پڑھ کر آپ بھی اپنا ایمان تازہ کر لیجئے۔

باب الملک عبدالعزیز، باب اجیاد، باب حنین، باب اسماعیل، باب صفا، باب ابوقبیس، باب ارقم، باب بنی ہاشم، باب علی، باب العباس، باب النبی، باب السلام، باب بنی شیبہ، باب حجون، باب المعلیٰ، باب المدعیٰ، باب العروہ، باب عثمان، باب مراد، باب معصب، باب عرفہ، باب منیٰ، باب قریش، باب قرارہ، باب ذی علویٰ، باب الفتح، باب ابن زبیر، باب عمر فاروق، باب الندوہ، باب شامیہ، باب القدس، باب مدینۃ المنورہ، باب حدیبیہ، باب مہدی، باب عمرہ، باب بدر، باب الشبیکہ، باب ابراہیم، باب ابوبکر صدیق، باب الہجرہ، باب وداع، باب ام ہانی۔

شاکر کنڈان نے اس سفر نامے میں جو کچھ لکھا اس میں مشاہدے اور مطالعے کے علاوہ سنی سنائی باتوں کا بھی دخل ہے۔ حرف محرمانہ میں شاکر کنڈان کا یہ بیان بھی قابل قدر ہے۔ مجھے اس بات کے اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ میں نے تاریخی حوالوں کو من وعن نقل کرنے کے علاوہ جہاں لفاظی کی خوب صورتی اپنی سوچ اور حالات کے مطابق پائی، ویسے ہی سپرد قلم کر دی''

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ''جادۂ شوق ومحبت'' ایسے سفر نامے، شہکار اور بے مثال سفر نامے، دلچسپ اور پر اثر سفر نامے کبھی کبھار ہی مطالعے میں آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

شام وسحر کے اداریے

کسی جریدے کا اداریہ اس کے مدیر کے ذہنی رجحانات ہی کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں کسی نظریے یا مکتبۂ خیال کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ رسائل و جرائد کے اداریے ان کے تخلیق کاروں اور قارئین کے درمیان ایک بلاواسطہ رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ سمجھ دار مدیر اپنے قارئین سے براہ راست ایک خوش گوار تعلق کی راہ ہموار کر لیتا ہے، اور باہمی اعتماد کی یہ فضا بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل بھی نکال لیتی ہے۔

ہم نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب مولانا صلاح الدین احمد کے ''ادبی دنیا'' اور ان کے اداریے ''بزم ادب'' کا بڑا شہرہ تھا، اس میں ان کے شریک مدیر ڈاکٹر وزیر آغا بھی اپنے دل کی باتیں تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات کے حوالے سے کھل کر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دور میں نقوش، ادب لطیف، افکار، رنگ، زمانہ، تہذیب و ادب، فیض الاسلام، الرشید، گجر، محفل اسلوب، سویرا، مینار اور نقیب کے پر مغز مختصر اداریے دامن کش دل ہوا کرتے تھے۔ پھر ادبی رسائل و جرائد سے اداریہ نویسی کا رجحان کم ہونے لگا اور اسے خالص صحافتی چیز تصور کیا جانے لگا۔

اداریہ نویسی کی روایت کو فنون اور اوراق نے دوبارہ زندہ کیا بلکہ ان جرائد نے کشادہ نظری کو راہ دی۔ ان کی پیروی میں تخلیق، ابلاغ، غنیمت، تجدید نو، منشور، صریر، شام وسحر اور مفیض اور دیگر ادبی رسائل کے بالغ نظر مدیران نے بلند فکری، روشن خیالی، غیر جانب داری اور خرد افروزی کے فروغ کے لیے اپنے اداریوں کو وسیلہ اظہار بنایا۔

افکار، صریر اور مفیض کے اداریے مستقل نوعیت کے مضامین کی ذیل میں آتے ہیں محدود ضخامت کے پرچوں کے اداریے اختصار اور اجمال کی ایک خوب صورت مثال ہوتے ہیں۔

Marfat.com

''شام سحر'' کے اداریے اس قبیل میں شامل ہیں۔

جنوری 1994 کے اداریے ''باتیں'' میں ''شام وسحر'' کے مدیر شبیہ الحسن ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔

''شام وسحر'' کم صفحات کا حامل ادبی ماہنامہ ضرور ہے لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ ضخیم رسائل کے ہم پلہ ہے۔ اس جریدے کو کسی قسم کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ اسے نہ تو اشتہارات ملتے ہیں اور نہ ہی رعایتی نرخوں پر کاغذ میسر ہے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ہم یہ رسالہ مسلسل نکال کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جہاد میں کامیابی وسائل سے نہیں ثابت قدمی سے حاصل ہوتی ہے''

مدیر ''شام وسحر'' نے مذکورہ اقتباس میں اسی قبیل کے محدود وسائل رکھنے والے بہت سے رسائل کے مدیران کے دل کی بات کہہ دی ہے۔

فروری 1994 میں مدیر ''شام وسحر'' نے ایک اہم مسئلے کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے:

''تخلیق کاروں کی باہمی آویزش نے معاشرے میں ادیب کے مقام کو انتہائی پست کر دیا ہے۔ معمولی سی رنجش کو بنیاد بنا کر یہ ادیب ایک دوسرے کے خلاف طنز و تعریض کے تیر برسانے لگتے ہیں۔ (اخباری) کالموں کے پیٹ نفرت آمیز مواد سے بھر دیے جاتے ہیں اور ذاتی مخاصمت کو قومی اور نظریاتی لڑائی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔''

گروہ بندیوں نے ادب اور ادیب کو کتنا نقصان پہنچایا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج کا قاری ادب اور ادیب سے نفرت کرنے میں حق بجانب ہے تو اس سے شکایت کیسی؟

مارچ 1994ء کے شام وسحر میں شبیہ الحسن نے ایک عام المیے کی جانب اشارہ کیا ہے:

''ادبی رسائل کی ترتیب واشاعت جان جوکھوں کا کام ہے۔ مواد کے حصول سے لے کر قارئین تک رسالے کی ترسیل جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ حکومت ادبی رسالوں کو خاطر

Marfat.com

میں نہیں لاتی اور حکومت کی منظور نظر تشہیری کمپنیاں صرف ان رسالوں کو اشتہارات سے نوازتی ہیں، جو محض حکومتی پالیسیاں اجاگر کریں اور حکومت کے ہر جائز و ناجائز کام کو صحیفہء آسمانی کے مطابق ثابت کردیں۔"

اس طرز عمل کے دیگر بہت سے رسائل بھی شاکی ہیں، وہ اکثر اپنے اداریوں میں اس بات کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ مئی 1994ء کے اداریے میں مدیر "شام وسحر" رقم طراز ہیں:

"یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ عصر حاضر میں پاکستانی ادیب اپنے فرائض سے غافل ہو کر مالی منفعت کے حصول میں تمام اخلاقی وادبی روایات کو پامال کررہے ہیں اگر یہ صورت حال کچھ عرصہ مزید جاری رہی تو معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خاتمہ ہو جائے گا اور ادب اپنی افادیت کھو بیٹھے گا۔"

کسی رسالے کے مدیر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عصری مسائل کی شدت سے بھی اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہے۔ مدیر "شام وسحر" اپنے اس فریضے سے غافل نہیں ہیں اور وہ اپنے قارئین کو ہمراہ لے کر چل رہے ہیں۔ جولائی 1994ء کے اداریے میں وہ دعوت دیتے ہیں:

"آیئے! عہد کریں کہ ہم ذاتی معاملات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ملکی اور قومی مفادات کا خیال رکھیں گے اور معاشرتی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کرتے رہیں گے"

"ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے مسئلہ کے حل میں دوسرا دلچسپی لے، اس صورت حال میں لوگ ادیبوں اور شاعروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح حالات کی تلخی کو شیریں بنانے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس صورت حال کی نزاکت کا احساس کریں اور ادب اور معاشرے کے باہمی تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں اپنا فعال کردار ادا کریں"

ایک اور انتہائی بری صورتحال کی جانب مدیر "شام وسحر" نے توجہ دلائی ہے اور اس بری رسم کو روکنے کی استدعا کی ہے

"ہمارے تخلیق کاروں کو اپنی زندگی میں کلیات چھپوانے کا "جنون" پیدا ہو گیا ہے۔

Marfat.com

ایک زمانے میں رحلت کے بعد کلیات کی اشاعت اس لیے قابل تحسین سمجھی جاتی تھی کہ اس طرح تخلیق کار کا مکمل تخلیقی سرمایہ قاری کے سامنے آجاتا تھا اور وہ اس کے حسن و قبح کا جائزہ لے کر تخلیق کار کے بارے میں حتمی رائے قائم کر لیتا تھا۔ زندگی میں کلیات کی اشاعت نے قاری کو الجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ شاید اس کلیات کے خالق کا تخلیقی سفر ختم ہو گیا ہے۔ تخلیق کاروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنا فاتحہ خود نہ پڑھیں، دوسروں کو بھی اس کا موقع فراہم کریں۔''

اکتوبر 1994ء کا اداریہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں شبیہ الحسن نے عہد حاضر کے ناقدین کے منفی رویے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ عصر حاضر کے ناقدین کی تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ فرمالیجئے، آپ خود محسوس کریں گے کہ بیشتر ناقدین نے دوسروں کے چراغ سے اپنے فکری چراغ روشن کیے ہیں۔ ناقدین ادب سے ہماری التماس ہے کہ وہ اپنے مقام و منصب کو بچائیں اور غیر جانب داری کے ساتھ تخلیق کاروں کو ان کا جائز مقام عطا کریں۔ اگر ناقدین نے یہ مخلصانہ روش اختیار نہ کی تو آنے والا وقت انہیں کبھی معاف نہ کرے گا۔''

اکتوبر 1994ء میں منعقد ہونے والی ''کانفرنس'' کا تمام حال احوال سامنے آچکا ہے اس کی مداح سرائی کرنیوالے بھی موجود ہیں اور اس میں نقائص تلاش کرنے والے بھی اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کر چکے ہیں۔ نومبر کے اداریے میں شبیہ الحسن نے اس حوالے سے سرکار کو مشورہ دیا:

''ارباب اختیار سے گذارش ہے کہ وہ قومی ادبی کانفرنس منعقد کرتے ہوئے سنیئر ادیبوں اور دانش وروں کے مشوروں سے کوئی حتمی پروگرام وضع کرے تا کہ اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں۔ موجودہ طرز عمل سے ادیبوں کے شکم پر اور ذہن خالی ہوتے جارہے ہیں''

سال کے آخری شمارے میں مدیر ''شام و سحر'' نے تحریر فرمایا:

''کسی بھی باشعور معاشرے میں ادیب، ادب اور قاری کی تکون بنیادی حیثیت کی

Marfat.com

حامل ہوتی ہے۔ اس تکون میں قاری کی حیثیت اس اعتبار سے کلیدی ہو جاتی ہے کہ اس کے تقاضوں سے ادب اور ادیب اپنا اپنا رخ تبدیل کر لیتے ہیں۔ اگر قارئین باذوق ہوں تو معاشرے میں مثبت طرز فکر کا حامل ادب تخلیق پاتا ہے۔"

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ادبی جریدے کی پالیسی اور ادبی جہت کا اندازہ اس کے مدیر کے لکھے ہوئے محتاط اور متوازن اداریوں سے کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

شکیب جلالی

افسانے سے حقیقت تک

شکیب جلالی ہماری ادبی تاریخ کا روشن باب، جدید طرز احساس کا عہد ساز شاعر اور ایک اہم ستون ہے، جدید غزل کی تاریخ جس کے ذکر کے بغیر تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتی۔

شکیب جلالی کے ابتدائی حالات زندگی، پاکستان میں آمد و قیام، نام کی غلط تشہیر، ملازمت کا حصول، تعلیمی سرگرمیاں شاعری کا آغاز، تلمذ کی فسانہ طرازی، ان کے والد کے بارے میں من گھڑت داستانیں، عزیز و اقارب کے بارے میں غلط فہمیاں اور ان کی کردار کشی، ان کی بیوہ کے انٹرویو میں غلط سلط معلومات، ان سے اپنے تعلق و دوستی کا اظہار، اور ادبی بونوں کی قلابازیاں، ان کے جنازے کے بارے میں تضاد بیانی، ان تمام عنوانات کا احاطہ کرتے ہوئے میں نے اس مختصر مضمون میں افسانے اور حقیقت کا تفاوت تحقیق کی روشنی میں منظر عام پر لانے کی جسارت کی ہے

بہت سے ''یکتائے روزگار حضرات'' شکیب جلالی کو اپنا پروردہ ثابت کر کے اپنا قد بڑھانے کی مذموم کوششیں کرنے میں مشغول ہیں۔ اس قسم کی کوشش اگر کم معروف یا گمنام قسم کے لوگ کرتے، تب بھی ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتے کہ آخر بے چارے اور کریں بھی کیا؟ انہیں اپنی اہمیت تو جتانی ہے۔ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مگر ستم ظریفی تو یہ ہے کہ شکیب جلالی کی موت پر اپنی شخصیتوں کے چراغ جلانے والے لوگ وہ ہیں جو پہلے ہی اچھے خاصے معروف ہیں اور ادبی دنیا میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔

جناب احمد ندیم قاسمی نے اپنے کالم ''لاہور لاہور ہے'' میں ''اردو کے ایک منفرد غزل گو شکیب جلالی کی خودکشی'' کے زیر عنوان روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی میں 20 نومبر 1966ء کو تحریر

Marfat.com

فرمایا:

''وہ (شکیب جلالی) بارہ برس کا تھا جب بنارس سے لاہور آیا۔ یہیں اس کی شاعری کا آغاز ہوا اور اسی ماحول میں اس کا فن نکھرا اور سنورا۔ اسلئے وہ سب سے پہلے لاہور کی متاع تھا''

جناب منشا پانی پتی ''خورشید سخن'' مطبوعہ 1980ء میں قیام پاکستان کے بارے میں زور قلم دکھانے کے بعد بتاتے ہیں۔

''اس زمانے میں شکیب بھی اپنے ماموں، ہمشیرگاں، خالہ اور دیگر اعزا کے ہمراہ تباہ حال وارد پاکستان ہوئے۔ پاکستان میں آنے کے بعد شکیب نے دسویں جماعت کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ سے پاس کیا۔ 1952ء میں ادیب فاضل کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی''۔

جناب شہزاد احمد ماہنامہ ''دھنک'' لاہور اپریل 1979ء میں اپنے مضمون ''دوسرا رخ'' میں امتیاز کلثوم صاحبہ کے ایم۔اے کے تھیسس کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

''شکیب نے محمد میاں نقوی اور محمد فاضل نقوی کے ساتھ اپنی بہنوں کو پاکستان بھجوا دیا مگر خود میٹرک کرنے کے بعد پاکستان میں آئے۔ یہ واقعہ دسمبر 1949ء کا ہے''

جناب سیف زلفی ماہنامہ ''گلفشاں'' لاہور مارچ 1979ء میں یوں ''گلفشانی'' فرماتے ہیں۔

''وہ (شکیب جلالی) میرا 52-1951 سے دوست تھا۔ ہفتہ میں ایک شام ضرور آتا اور رات کو دو بجے تک میرے ساتھ سڑکوں پر گھومتا پھرتا۔۔۔۔۔ بہر حال میرا قیاس ہے کہ شکیب 1934ء میں بدایوں میں پیدا ہوا۔ اس کے والد سید جعفر حسین پولیس میں ملازم تھے۔ شکیب کا نام سید حسین رضوی رکھا گیا۔ اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج بریلی میں وہ میرا ہم جماعت تھا (یہ چھٹے درجے کی بات ہے)۔۔۔۔۔ پاکستان بنتے ہی شکیب یہاں ہجرت کر کے آ گیا۔ جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو وہ ان دنوں ماہنامہ ''شاہکار'' کا ایڈیٹر تھا۔۔۔۔۔ غالباً 1955ء کی بات ہے

Marfat.com

کہ وہ کراچی شادی کرنے گیا‘‘

مذکورہ بالا تمام اقتباسات میں حقائق سے پہلو تہی کی گئی ہے اور افسانوی انداز میں اصل واقعات کا منہ چڑایا گیا ہے۔ شکیب جلالی کے سوانح نگاروں نے ظن وتخمین پر اپنے مضامین کی عمارت کھڑی کی ہے۔ تحقیق کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ سنے سنائے واقعات کو دہراتے چلے گئے۔ شکیب کا جن لوگوں سے گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے بھی گونگے کا گڑ کھالیا تھا۔ منشا پانی پتی جیسے محقق لنگر لنگوٹ کس کر میدان تحقیق میں کود پڑے۔ ’’خورشید سخن‘‘ میں یقین دلایا ہے کہ موصوف انگریزی بھی جانتے ہیں اور ادب کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ خاص طور پر لاہور کی بابت یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ اس طرح ’’لاہور شاعری میں بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے‘‘ اس ادبی کولمبس نے اپنے استاد احسان دانش کو دریافت کیا۔ ان کا خیال ہے کہ جن شکیب کے شعر کہتا تھا۔ طب یونانی اور نفسیات سے بھی واقف ہیں۔ اپنی کمپنی کی مشہوری کیلئے ’’خورشید سخن‘‘ شائع کی گئی ہے۔ منشا صاحب نے شکیب کی سنگت کی نہیں۔ جو کچھ لوگوں نے من گھڑت سنائی، انہوں نے لکھدی۔ کوئی راوی معتبر نہیں۔ جو معتبر ہے وہ بولتا نہیں۔ اسے اپنے نام سے آگے آنا چاہیے تاکہ حقائق منظر عام پر آئیں۔

شکیب جلالی کا اصل نام سید حسن رضوی تھا۔ وہ یکم اکتوبر 1934 کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن سرسی تھا۔ دسویں جماعت کے امتحانات شروع ہی ہونے والے تھے کہ تین چار دن پہلے سب گھر والے راولپنڈی چلے آئے اور شکیب امتحانات کی وجہ سے اپنے دوست رشید الظفر لودھی کے پاس وہیں ٹھہر گئے۔ امتحانات سے فارغ ہوکر شکیب جلالی 8 مئی 1948ء کو راولپنڈی پہنچے۔ جون کے مہینے میں انہیں -/15 روپے ماہوار پر مقامی ’’ڈھمپ‘‘ میں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد اکتوبر 1948ء کو ’’سنٹرل کواپریٹو بنک‘‘ کی مقامی شاخ میں ملازم ہوگئے جہاں ان کی تنخواہ -/108 روپے ماہانہ تھی۔ شکیب راولپنڈی میں اپنے ماموں سید محمد میاں نقوی (سپرنٹنڈنٹ جی ایچ کیو) کے ساتھ اقامت پذیر تھے۔ جب ان کے ماموں کا تبادلہ کراچی ہوگیا

Marfat.com

تو وہ اپنے اہل وعیال کے علاوہ شکیب کی چھوٹی بہن، خالہ اور خالہ زاد بہن کو بھی ساتھ لے گئے۔
تب شکیب جلالی، سید ماجد الباقری کے ساتھ ان کے گھر واقع لنڈا بازار راولپنڈی میں رہنے لگے۔ ماجد الباقری کے والد صاحب شکیب کو اپنے بیٹوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ انہیں دنوں شکیب اور ماجد الباقری نے مل کر ماہنامہ ''گونج'' کے نام سے ایک ادبی پرچے کا اجرا کیا۔ ''گونج'' کی ادارت میں شکیب جلالی اور علی زاہد کے نام تھے۔ شکیب ''رمز گارکی'' اور ماجد الباقری ''سمالی الپاکی'' کے نام سے ''گونج'' میں افسانے لکھتے تھے۔ شکیب جلالی ادیب فاضل کے امتحان میں تین بار فیل ہوئے اور چوتھی مرتبہ کامیاب ہوئے۔

مئی 1953ء میں شکیب ''جاوید لمیٹیڈ لاہور'' کی شاخ (سیالکوٹ) کے انچارج بنے اور سیالکوٹ چلے گئے۔ وہاں سے ماہنامہ ''عجیب'' نکالنا چاہتے تھے۔ سیالکوٹ میں انہیں جوادبی حلقہ ملا ان میں سرور مجاز، تصور کرتپوری، شکیل ضیا، پرویز گل اور عاصم صہبائی کے نام شامل ہیں۔
''گونج'' شکیب کے راولپنڈی سے چلے جانے کے بعد بھی نکلتا رہا۔ محترمہ محدثہ خاتون (بیوہ شکیب جلالی) نے ''اخبار خواتین'' کراچی کی اشاعت 13-7 جنوری 1981ء میں اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف فرمایا تھا۔

''وہ (شکیب) 1935ء میں پیدا ہوئے۔ 1950ء میں اپنے ماموں کے ساتھ پاکستان آئے۔ یہاں آکر ماموں صاحب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ 16 سال کی عمر میں نوکری کی۔ کچھ روپیہ جمع ہو گیا تو جناب ماجد الباقری کے ساتھ مل کر رسالہ ''گونج'' جاری کیا اور اس رسالے سے انہوں نے اپنی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کیا مگر افسوس ماجد الباقری صاحب سے اختلاف ہو گئے۔ جس کی وجہ سے رسالہ بند ہو گیا۔۔۔ پہلے کمال تخلص کیا پھر میرے کہنے پر شکیب اختیار کیا۔۔۔''

محترمہ کے بیان کا موازنہ سطور بالا سے کریں تو فرق صاف ظاہر ہے۔ جہاں تک تخلص کے تجویز کرنے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں حقیقت تو یہ ہے کہ حسن رضوی محترمہ کی کم سنی ہی میں

Marfat.com

شکیب جلالی بن چکے تھے۔شادی تو ان کی 1956ء میں ہوئی تھی۔

ماجد الباقری اپنے مضمون ''شکیب جلالی'' مطبوعہ ہفت روزہ ''نشانہ'' لائل پور (فیصل آباد) 24 مئی 1967 میں بتاتے ہیں۔

''مرحومہ کا پورا نام سید حسن رضوی تھا۔ابتدائی چند غزلوں میں کمال تخلص پسند کیا۔یوں تو پیار میں چند عزیز اقارب انہیں ''سلطان میاں'' بھی کہا کرتے تھے۔میرے کہنے پر انہوں نے شکیب جلالی تخلص اختیار کیا۔اس ضمن میں ''جلالی'' کے لفظ کا کوئی تعلق حکیم سید ضامن جلال سے نہیں ہے اور نہ ہی استاد قمر جلالوی سے بلکہ تخلص کی انفرادیت کو قائم کرنے کیلئے جلالی لکھا گیا تھا اور نام کی یہ انفرادیت ہمیشہ قائم رہے گی''۔

جناب شہزاد احمد ''دوسرا رخ'' میں لکھتے ہیں۔

''بعض لوگ ماجد الباقری کو شاعری میں شکیب جلالی کا استاد بتاتے ہیں،مگر خود باقری صاحب اس امر سے انکار کرتے ہیں۔اس وقت شکیب کی عمر سترہ (17) برس تھی''

راقم (سجاد مرزا) اس بات کی تحقیق کر چکا ہے کہ واقعی ماجد الباقری صاحب شکیب کے استاد ہیں۔جناب سرور مجاز (سابق سب ایڈیٹر روزنامہ ''مشرق'' لاہور) نے بڑے وثوق سے اس کی تصدیق کی ہے کہ شکیب برملا کہا کرتے تھے کہ سید ماجد الباقری شاعری میں میرے استاد ہیں۔

جہاں تک شکیب کے اصل نام کا تعلق ہے ''خورشید سخن'' کے سرورق پر جلی حروف میں سوانح حیات ''سید حسین شکیب جلالی'' مرقوم ہے۔جناب منشا پانی پتی کی تقلید میں روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور کے 4 جنوری 1990 کے ادبی ایڈیشن میں خواجہ تصور علی حیدر ''جواں مرگ شاعر'' کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:

''شکیب جلالی کا نام سید حسین رضوی تھا اور وہ یکم اکتوبر 1934ء میں ضلع علی گڑھ (یو۔پی) کی سادات کی مردم خیز بستی جلالی میں پیدا ہوئے تھے۔''

روزنامہ ''مشرق'' لاہور کے ادبیات 29 ستمبر 1990ء کالم'' آنے والے جانے

Marfat.com

والے'' میں عارف محمود نے تاریخ پیدائش میں ''حسین رضوی شکیب جلالی'' یکم اکتوبر 1934ء ہی بتایا ہے۔

منشا پانی پتی، سیف زلفی، خواجہ تصور علی حیدر اور عارف محمود صاحبان اگر شکیب جلالی کے مجموعہ کلام ''روشنی اے روشنی'' کا پہلا ایڈیشن جو اگست 1972 میں منصۂ شہود پر آیا تھا دیکھ لیتے، تو اس غلطی کا اعادہ ممکن نہیں تھا۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے ''روشنی اے روشنی'' کے فلیپ پر سید حسن رضوی ہی تحریر فرمایا ہے۔

''خورشید سخن'' کے مولف شکیب جلالی کے والد ماجد کے بارے میں فرماتے ہیں:

''آپ نہایت ہی خوبصورت، وجیہہ اور خوش رو جوان تھے۔ فطرتاً آپ انتہائی حسن پرست اور رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ محکمہ پولیس میں آپ کا شمار قابل ترین تھانیداروں میں ہوتا تھا۔ افسران بالا آپ کی خداداد ذہانت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے قائل تھے۔ علاقے میں صغیر حسین ہی کا طوطی بولتا تھا۔ آپ نے اس زمانے میں ہر وہ شوق پورا کیا جو اکثر پولیس افسران حکومت کے نشے میں کر گزرتے ہیں۔ ہر وقت محفل عیش ونشاط گرم رہتی اور رقص وسرور میں بیشتر وقت گزرتا''

''خورشید سخن'' کے صفحہ نمبر 12 پر صغیر حسین ہی کے بارے میں انکشاف کیا گیا ہے:

''پروفیسر مقصود احمد خان بریلوی جن کی عمر کا بیشتر حصہ بسلسلہ حصول تعلیم بدایوں میں گزرا کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے ایسے بے شمار واقعات سید صغیر حسین صاحب کے متعلق سنے ہیں کہ جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ سید صاحب ایک صاحب کرامات بزرگ تھے جن کی ذات سے بہت سے واقعات مافوق الفطرت صادر ہوتے تھے''

اسی کتاب کے صفحہ 72-71 پر تحریر ہے۔

''ہزاروں لوگ شکیب کے جنازے میں شریک تھے اور ہر آنکھ اس کے غم میں اشک بار تھی۔ مقامی شعرا اور ادیب کافی تعداد میں جنازے کے ہمراہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سرگودھا شہر سے شعر وادب کا جنازہ نکل رہا ہے اور آسمان علم پر ماہتاب برج عقرب میں اور آفتاب کو گہن

Marfat.com

لگ رہا ہے''

جناب منشا پانی پتی کے اس بیان پر مجھے کسی تبصرے کی ضرورت اسلئے نہیں کہ ایک عینی شاہد جناب وزیر آغا ہفت روزہ ''ریاست'' استقلال نمبر 1970ء میں ''یاد رفتگاں'' کے زیر عنوان رقمطراز ہیں۔

''شکیب جلالی نے اپنی ادبی زندگی کا بڑا حصہ ضلع سرگودھا میں ہی بسر کیا۔ اسلئے مجھے ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے اور ان کے ذہنی اور جذباتی مد و جذر کو قریب سے دیکھنے کے مواقع اکثر ملتے رہے۔ وہ لاہور میں ذہنی امراض کے ہسپتال سے فارغ ہو کر سرگودھا پہنچے تو سب سے پہلے میرے پاس آئے۔ کئی گھنٹے میرے کتب خانے میں بیٹھے رہے۔ مجھ سے روح کے بارے میں سوال کرتے رہے اور کبھی کہتے بتایئے موت کے بعد کیا ہوگا؟۔۔۔ میں اور پروفیسر جیلانی جب ان کے جنازے میں شامل ہوئے تو کس مپرسی اور بے بسی ساری فضا پر مسلط تھی۔ ان کے دوست، احباب میں سے کوئی بھی جنازہ میں شامل نہیں تھا۔ اہل شہر میں سے بھی کوئی نہ آیا تھا۔ ان کے دو ایک رشتہ دار البتہ موجود تھے یا پھر قریبی مکتب سے چند طلبا خاص طور پر جنازہ اٹھانے کیلئے بلائے گئے تھے''

جناب راغب شکیب ہفتہ وار ''کوہسار جرنل'' بھاگلپور (بھارت) کی اشاعت 28 اپریل 1989ء میں اپنے مضمون ''شکیب جلالی کی خودکشی'' میں ''خورشید سخن'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بھکر سے خواجہ قریش علی منشا نامی ایک شخص نے شکیب جلالی کے بارے میں ''خورشید سخن'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خلش صہبائی نے ایک سوال کے جواب میں بتایا:

''اس کتاب کو شائع کرنے والا شخص انتہائی پست معیار کا شاعر ہے۔

اس نے اپنے آپ کو شکیب کا دوست ظاہر کر کے اپنا قدم بڑھانے اور خاص طور پر خلیل رام پوری کو

Marfat.com

آزدینے کیلئے یہ کتاب تحریر کی ہے"

خلش صہبائی کی بات میں یقیناً صداقت ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے منشا صاحب حقائق پر دانستہ پردہ ڈالنے کیلئے "خلوص دل" سے کوشاں ہیں۔موصوف فرماتے ہیں:

"خلیل رام پوری کے ساتھ شکیب مرحوم کی دوستی کا آغاز بھکر سے نہیں، بلکہ 55-1954ء مشاعرۂ نوشہرہ سے ہوتا ہے۔ جب مرحوم رسالہ "گونج" راولپنڈی سے منسلک تھے۔دونوں کے نظریات یکساں اور احساسات میں یگانگت تھی۔عرصہ دراز تک دونوں کے مضامین اور کلام روزنامہ "امروز" میں شائع ہوتے رہے۔چونکہ دونوں کے حالات پاکستان میں آنے کے بعد تقریباً ایک ہی نوعیت کے تھے۔دونوں کا دماغی رجحان بھی فلسفہ مارکسزم کی جانب تھا اور دونوں کے فکر ونظر میں یگانگت، یکسانیت اور مطابقت پائی جاتی تھی اور کیمونزم سے دونوں متاثر تھے۔ اسلئے عرصہ درواز تک دونوں حضرات کی نقل وحرکت پر حکومت پاکستان کی کڑی نگرانی رہی۔یہاں تک کہ دونوں کو کافی عرصہ تک بھارتی جاسوس تصور کیا جاتا رہا۔-----

"احسان دانش صاحب نے فرمایا" ابتدائی استاد کا تو مجھے بھی علم نہیں۔لیکن کبھی کبھار مرحوم مجھ سے اصلاح لیتے تھے"-----یہ بات بھی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شکیب احسان دانش کے کلام سے زیادہ متاثر تھے-----یہاں تک کہ جب شکیب کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو خلیل (رام پوری) خلش (محمد نواز) اور زیدی صاحب (سید ارتضٰی حسین) نے مرحوم کی بڑی امداد کی جن کے ثبوت میں شکیب کا تحریر کردہ خط جو انہوں نے مرنے سے پانچ یوم قبل 7 نومبر 1966ء کو سرگودھا سے تحریر کیا ہے، شعرائے بھکر کی گلوخلاصی کیلئے پروانہ نجات سے کم نہیں۔ذیل میں خط کا مضمون بعینہ پیش کرتا ہوں۔

7 نومبر 66ء

مکرمی ومخدومی جناب خلش صاحب

سلام نیاز۔عنایت نامہ موصول ہوا۔کرم فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔میری حالت اب خدا

Marfat.com

کے فضل وکرم سے بہتر ہے لیکن دل ودماغ کی کمزوری کے باعث مکمل سکون نہیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھ پر، میرے بچوں پر رحم فرمائے اور میرے حالات درست کردے۔ میں کل ہسپتال سے (Rest) کا سرٹیفکیٹ لینے لاہور جارہا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر بشرط زندگی ایک بار ضرور بھکر آؤں گا۔ خلیل صاحب، آسی صاحب اور حیا صاحب کی خدمت میں سلام۔ آپ لوگ میری جملہ خطائیں بخش دیجئے گا۔ شاید پھر معافی مانگنے کی مہلت نصیب ہو یا نہ ہو۔ حسن اختر صاحب آج کل وہیں ہیں۔ ان کو بھی سلام نیاز مندانہ پہنچے۔ ان کے بھائی آفتاب حسن صاحب نے مجھ سے جوہرآباد میں ایک وعدہ کیا تھا۔ کیا اس کے ایفا ہونے کی نوبت نہ آئے گی؟

فقط ناچیز

شکیب جلالی

جناب شہزاد احمد محترمہ محدثہ خاتون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شکیب کے دو دوست اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے بھکر والے دوست بے گناہ ہیں مگر بیگم شکیب متفق نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں وہ شخص اگر بے گناہ تھا تو کم از کم شکیب کی موت پر افسوس کیلئے ہی آجاتا!''

شکیب جلالی کے لخت جگر نے 12 مارچ 81ء میں سید ماجد الباقری کے نام ایک خط لکھا تھا۔ اس خط کا عکس دیکھئے۔ کسی بات یا تبصرے کی مزید گنجائش نہیں۔

کراچی ۱۲ مارچ ۸۱ قابل صد احترام انکل

تسلیمات

آپ کی خیریت مالک کل سے نیک چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تحریر آپ کیلئے اجنبی ہو۔ لیکن میں آپ کو اپنے والد گرامی شکیب جلالی (مرحوم) کے مخلص دوست اور بھائی کی حیثیت سے چچا کا درجہ دیتا ہوں۔

امید ہے آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔ اگر نہیں تو میں شکیب جلالی کا بیٹا سید حسین

Marfat.com

اقدس رضوی عالی ہوں۔

آپ کو پہلی بار خط تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اسلئے تحریر میں اگر کچھ خامیاں ہوں تو درگزر فرمائے گا۔

میں نے کراچی کے روزنامے ''جنگ'' میں ۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو گجرات کی ادبی سرگرمیاں جو کہ بزم شکیب کے مخرم سیکرٹری جناب غفور اسلم نے تحریر کیں تھیں۔ اس میں جبار آرٹ گیلری میں آپ کی صدارت میں ''بزم شکیب'' کے اجلاس کا ذکر ہے۔ اسمیں ایک قرارداد بھی منظور ہوئی۔ جو کہ والد گرامی (مرحوم) کی سوانح کے متعلق ہے۔

اس لئے بارے میں عرض ہے کہ ایک ابو کی سوانح بھکر سے جناب ''خواجہ قریش علی منشا پانی پتی'' کی تحریر کردا شائع ہوئی ہے کیا وہ وہی سوانح ہے یا آپ لوگ کوئی سوانح شائع کر رہے ہیں۔ اسکے بارے میں مجھے جلد از جلد مطلع کریں۔

اگر وہ وہی سوانح ہے جو آپ شائع کر رہے ہیں تو اسمیں چند ایسی بنیادی غلطیاں ہیں۔ جسنے والد صاحب (مرحوم) کی شہرت کو اور ہم کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ آپ سے عرض ہے کہ آپ اسکی تصحیح فرما دیں۔ امید ہے وہ آپ نے بھی پڑھی ہوگی۔

اگر وہ سوانح نہیں تو آپ اسکو مندرجہ ذیل پتے سے حاصل کر کے یا اگر آپ کے پاس ہو تو لے کر پڑھ کر اسکی غلطیون کے بارے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسکی خرافات کے بارے میں میں جنگ میں ایک مضمون لکھیں۔ جسمیں منشاء صاحب کو حقیقت سے آگاہ کریں۔

عین نوازش ہوگی

منشا پانی پتی صاحب کا پتا

مرغوب منزل حالی روڈ بھکر ضلع میاں والی

ناچیز کا پتا۔

سید حسین اقدس رضوی عالی

Marfat.com

مکان نمبر 149اے بلاک نمبر 15

گلشن مصطفےٰ دستگیر کالونی فیڈرل بی ایریا کراچی 38

امید ہے اس سلسلے میں آپ اپنا قلم اٹھا کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔ آپ اپنی شائع کردہ سوانح کے بارے میں صرف تصدیق شدہ باتیں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

والسلام عالی (شکیب جلالی)

اخذ و استفادہ:

۱۔ روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی 20 نومبر 66ء اردو کے منفرد غزل گو شکیب جلالی کی خودکشی، احمد ندیم قاسمی۔

۲۔ ہفت روزہ ''نشانہ'' لائل پور 24 مئی 67ء ''شکیب جلالی'' از ماجد الباقری۔

۳۔ روزنامہ ''جنگ'' کراچی 29 دسمبر 80ء ''شکیب جلالی'' از محمد اسماعیل۔

۴۔ ہفت روزہ ''الحدید'' گجرات 4 نومبر 80ء ''شکیب جیلالی'' از ماجد الباقری۔

۵۔ ہفت روزہ ''اخبار خواتین'' کراچی 7/13 جنوری 81ء ''شکیب جلالی کی کہانی'' انٹرویو پروین جاوید۔

۶۔ ماہنامہ ''دھنک'' لاہور اپریل 79ء ''دوسرا رخ'' از شہزاد احمد۔

۷۔ ہفتہ وار ''کوہسار جرنل'' بھاگلپور (انڈیا) 28 اپریل 89ء ''شکیب جلالی کی خودکشی'' از راغب شکیب۔

۸۔ ہفت روزہ ''ریاست'' استقلال نمبر 70ء ''یادِ رفتگاں'' از وزیر آغا۔

۹۔ ''خورشید سخن'' از منشا پانی پتی۔ مطبوعہ 1980ء

۱۰۔ ''روشنی اے روشنی'' مجموعہ کلام شکیب جلالی، مطبوعہ اگست 1972ء

۱۱۔ ماہنامہ ''گلفشاں'' لاہور۔ مارچ 1969ء

۱۲۔ سید ماجد الباقری کے نام آئے ہوئے خطوط۔

Marfat.com

زادِ ہجر

قائم نقوی صاحب، زبانوں، بے زبانوں اور بدزبانوں کے شہر میں بہت خاموشی کے ساتھ اپنے تخلیقی سفر میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کا فکری منظر نامہ تشکیک زدہ معاشرے اور تضادات کے شکار اذہان کو آشکار کرتا ہے۔ سماج میں پھیلی ہوئی غلط رسوم کی نشاندہی کا منصب بھی انہوں نے اپنی شاعری کو سونپ رکھا ہے۔ اوہام پرست لوگوں کے در احساس پر دستک دینا بھی اس میں شامل ہے۔ حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کی راہ دکھانا بھی ان کی ترجیحات کا حصہ ہے۔

قائم نقوی صاحب، خدا معلوم، اس شہر میں کس طرح جی رہے ہیں؟ جس شہر کے رہنے والوں کے دل پتھر، ذہن پتھر حتیٰ کہ ضمیر پتھر ہو چکے ہیں اور ساری آنکھیں بینائی سے عاری ہیں۔ شعور و آگہی کا سورج چمکے بھی تو جہالت اور ظلمت کا سینہ چاک نہیں ہوتا! شاید نقوی صاحب کی کھلی آنکھ میں ان کے اپنے ضمیر کی روشنی کا انعکاس ہے اور یہی روشنی کا انعکاس قدم قدم پر ان کی راہنمائی کر رہا ہے!

قائم نقوی صاحب جس سادگی، تحمل مزاجی اور خوب صورتی سے نظم اور غزل کہہ رہے ہیں، آج کے پرآشوب دور میں ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ نقوی صاحب شاید خود کو اپنے عہد سے ناک سے ہم آہنگ نہیں کر پائے، ورنہ عصر حاضر کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ آج تو مانگے کی چند غزلوں کے سہارے یار لوگوں نے اپنے شاعر ہونے کا وہ ڈھنڈھورا پیٹا ہے کہ دنیا کے دور دراز ممالک سے عالمی مشاعروں کے دعوت نامے اس تواتر سے چلے آ رہے ہیں کہ یار لوگ پہلے سفر کا سامان اور تحائف کے بنڈل ابھی کھول نہیں پاتے کہ کسی دوسرے ملک کے سفر کے لیے تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کاش! قائم نقوی جیسے بھلے مانس کو بھی یہ گُر آ جاتا!

Marfat.com

''زادِ ہجر'' قائم نقوی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا خوب صورت مجموعہ ہے، جس میں ایک نعت، ایک سلام، چھبیس نظمیں اور انتیس غزلیں شامل ہیں۔ ان کی تخلیقیت میں سادگی ہی نہیں پرکاری بھی ہے۔ روایت کی پاس داری ہی نہیں جدیدیت کے ہفت رنگوں کی آمیزش بھی ہے۔ قائم نقوی نے روایت کے ہیئتی اور اسلوبیاتی سانچوں میں توڑ پھوڑ کے عمل سے اجتناب روا رکھا ہے اور موضوعاتی سطح پر تازہ کاری اور تازگیٔ فکر وخیال سے اپنی نظموں اور غزلوں کو ترفع سے ہم کنار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند شعر اور ایک مختصر سی نظم ملاحظہ کیجئے۔

میں تو بس اس دھن میں قائم شاخ سے چمٹا رہوں
آتے جاتے موسموں کے ذائقے چکھتا رہوں!

☆☆☆

سچ کو سچ لکھنے سے قائم ہم اکثر گھبرائے ہیں
جانے کتنے جھوٹ گھڑے تو دانشور کہلائے ہیں

☆☆☆

تو شہر میں ہے اجنبی کوئی مکاں بھی ڈھونڈ
کیوں کر کٹے گی شب کسی در پر پڑے پڑے

☆☆☆

وہ بھی کیسے دن تھے
جب
میں جون کی گرم دوپہروں میں
جلتی تپتی راہوں میں
خود کو کھونے لگتا تھا
تجھ کو دیکھ کے

Marfat.com

خود کو ڈھونڈا کرتا تھا! (ناسٹیلجیا)

''زادِ ہجر'' کی نظموں کے عنوانات بھی دل کو بھلے لگتے ہیں۔ چند عنوانات:

ایک گلی میں آخری آہٹ، یہ لوگ کیا ہیں، ہرن مینار، نیا سال، سچ، مستقبل، ایک بے نام خواب کی تعبیر، اے اسرافیل آ۔۔۔ وقت کا عادل، یکسانیت، ادارک، بے یقین موسم، تتلیوں کے مارے، ہم آدم، ہم آدم کے بیٹے، چھدرے چھدرے خیال، عالم اسلام کیلئے ایک نظم، اقبالؒ کے حضور، ایک اعتراف، مجید امجد کیلئے ایک نظم، وطن کے لیے، دروازہ کھلا رکھنا وغیرہ۔

ایک بزرگ نے اپنے انٹرویو میں، کوئے ملامت سے زہر میں بجھا ایک تیر چھوڑا ہے۔ ''آج کے تمام شاعر سرکٹی لاشیں معلوم ہوتے ہیں!''۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت کے کھونٹے سے بندھے، داغ کے مقلدین یہ حضرات اپنے سوا کسی کو پڑھتے ہی نہیں۔ اگر بھولے سے کسی جدید شاعر کی کوئی تخلیق دیکھ لیں تو اس میں صرف عیب تلاش کرتے ہیں۔ خوبیوں پر ان کی کم زور نظر نہیں پڑتی! سچ تو یہ ہے کہ نئی نسل کے جوان فکر شعرا بہت اچھی نظم اور غزل کہہ رہے ہیں۔ ثبوت کے طور پر ''زادِ ہجر'' اور اسی قبیل کے ہم متعدد مجموعوں کے نام پیش کر سکتے ہیں۔

جدیدیت اور ترقی پسندی کو برا بھلا کہنے والے ان قابل صد احترام بزرگ حضرات کو اپنی جھوٹی انا کے گدلے جوہڑ سے اب باہر نکل آنا چاہیے۔ ترقی پسندی اور اشتراکیت کو شاید ان لوگوں نے ہم معنی سمجھ رکھا ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسندی، عصری آگہی اور متداول تخلیق کاری کسی طرح بھی ''جدیدیت'' سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ جدیدیت کا اپنا ایک منفرد ذائقہ، اپنا ایک الگ اسٹائل، اپنا اسلوب اور اپنا انداز بیاں ہے۔ اس کے حصار میں داخل ہونے کے لیے کسی بھی روایت پرست تخلیق کار کو اپنے ایمان کی قربانی دینا ہوگی! اس حوالے سے قائم نقوی جدید شعرا کی صفِ اوّلین میں شامل ہیں۔

عصری مسائل کے ہجوم میں ''بے گھری کا المیہ'' ہم میں سے بہت سوں کا ایک ذاتی

Marfat.com

مسئلہ ہے۔ جدید شعراء نے اپنے دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ اس گمبھیر مسئلے کو اپنی شعری تخلیقات میں نمایاں جگہ دی ہے۔ قائم نقوی کے اس موضوع پر یہ شعر دیکھئے۔

منزل پانے کی ان دیکھی خواہش میں
اک مدت سے ہم نے اپنا گھر نہیں دیکھا

☆☆☆

تلاش رزق میں ہم بھی چلے تھے
مگر گھر لوٹ کر آئے نہیں ہیں

''کربلا'' کے استعارے میں استحصالی قوتوں کے خلاف ایک واضح اظہار کی راہ دکھائی دیتی ہے۔ اس راہ پر چلنے والے سچائی کے علم بردار ہر عہد میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ قائم نقوی نے اس استعارے کی عصری سچائیوں پر جس فن کاری سے تطبیق کی ہے۔ اس نے فکر و احساس کے نہ جانے کتنے دریچوں پر دستک دی ہے اور اس دستک کی گونج ''زادِ ہجر'' کی شاعری کو اعتبار ہی نہیں وقار سے بھی ہم کنار کرتی ہے۔

پیاس کی فصلیں اگا لو لب بہ لب
شہرِ جاں اب کربلا ہو جائے گا

☆☆☆

ہم زمین کربل میں ، ہم یقین مقتل میں !
ٹوٹ کر بکھر کر بھی اک گماں میں زندہ ہیں

☆☆☆

ہمارا قتل ہوا دفتروں کی کربل میں
ہم اپنے نقش فقط فائلوں پہ چھوڑ گئے

☆☆☆☆☆

Marfat.com

حضرت خواجہ کریم اللہ عباسی قادریؒ کی غزل نگاری

حضرت خواجہ کریم اللہ عباسی قادریؒ کی غزل میں فکر و آگہی کے ساتھ ساتھ پر گوئی اور مشاقی بھی ہے اور اپنے عصر کی روایت سے آشنائی کا اسلوب، انداز نظر اور حسن بیاں کی طلسم کاری بھی ہے۔ ان کے عہد کی غزل کا یہی امتیاز حسن تھا کہ مسائل تصوف بڑے دل کش اور دل نشین انداز میں اشعار کی صورت میں ڈھالے جائیں۔

عصری سیاست کے دجل و فریب سے اہل وطن کو محفوظ و مامون کرنے کے لیے صوفی شعراء کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں کی باطنی تطہیر کیلئے انہوں نے شعر سے بہت موثر کام لیا! اور یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس طریق کار سے ابنائے وطن کے دلوں سے گورے آقاؤں کی حکمرانی کا خوف اور دبدبہ کم ہوا۔ ان کے دلوں میں ایمانی قوت کی روشنی کا احیا ہوا، اور آزادی کی تڑپ انگڑائی لے کر بیدار ہوئی!

یہ سب حضرت خواجہ کریم اللہ عباسی قادریؒ ایسے صوفی شعراء کا حسن کمال اور فیضان نظر ہے کہ مسلمانوں کو ایک آزاد وطن کی نعمت میسر آئی جس میں وہ بلا خوف و خطر اپنے دینی اور مذہبی فرائض ادا کر سکتے ہیں۔

"فَاذْکُرُونِي اَذْکُرْکُمْ" پر صوفیا کا عمل راسخ ہو جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ذکر سے غفلت، موت کے مترادف ہے۔

"جو دم غافل سو دم کافر" کا نعرۂ مستانہ، خواب غفلت میں کھوئے ہوؤں کے لیے ایک تازیانہ ہے۔ شاید کہ ان کی باطنی آنکھ بھی کھل جائے!

یاد وہ کرتا ہے اس کو، جس کو وہ کرتا ہے یاد

Marfat.com

اس کو پا لیتا ہے جو کرتا ہے اس کی جستجو

☆☆☆

مومنوں کے دل پہ آتا ہے سلام اللہ کا
قلب مومن، عرشِ حق ہے، چھوڑ باقی گفتگو

☆☆☆

اے کریمی ثم وجہ اللہ پہ ہے جس کی نظر
چہرہ انوار کو وہ دیکھتا ہے چار سو

صوفی کا مقصود اللہ، مطلوب اللہ، محبوب اللہ، اس کا جینا مرنا، اس کی فکر، اس کی عبادت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے اور ماسوائے حق سے وہ ہر حال میں بیگانہ ہو جاتا ہے۔

خواجہ صاحب کے درج ذیل اشعار کچھ ایسی ہی کیفیت کے غماز ہیں۔

ہائے صد افسوس! ناواقف رہے توحید سے
وہم دوئی نے دل زندہ کو بے دم کر دیا

☆☆☆

قرب حق کے فکر سے بے فکر ہیں، ناکام ہیں
لحظہ لحظہ زندگی کا آہ! پُر غم کر دیا

☆☆☆

رہ گئے دوئی میں کیوں وہ، جانتا ہوں میں کریم
پشت کی دل کی طرف، منہ طرفِ عالم کر دیا

یہی اہل بصیرت ہیں جو جز میں کل کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ یہی فنافی الذات ہیں، یہی تارک لذات ہیں اور یہی دریائے معرفت کے رمز شناس ہیں۔

ہے کہاں وہ عشق جو عاقل کو دیوانہ کرے؟

Marfat.com

ہے کہاں وہ عشق جو جاہل کو فرزانہ کرے؟

☆☆☆

ہے خوشا وہ عشق جو دیتا ہے مدہوشی کا جام
عقل کو سودا کرے اور دل کو مستانہ کرے!

☆☆☆

ہے خوشا وہ عشق جو ہستی سے کر دے بے خبر
جام وحدت کا پلا کر وصل جانانہ کرے

خواجہ کریم اللہ عباسی قادریؒ نے اپنی غزلیات میں جو نکات بیان فرمائے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔

معرفت، اسرار وحدت فضل ربانی سے ہے
عشق کی بنیاد سالک! فیض یزدانی سے ہے

☆☆☆

عشق کی لذت، جہاں کی لذتوں سے ہے عجیب
عشق کی خلوت منور نور سبحانی سے ہے

☆☆☆

زندگی کی گر تمنا ہے تو کر خود کو فنا!
یہ بقائے جاودانی، ہستی فانی سے ہے

☆☆☆

ہے مقام معرفت، علم و ہنر سے ماورا
چھوڑ یہ علم و ہنر، یہ جائے حیرانی سے ہے

☆☆☆

بے نشاں میں بے نشاں ہو، ہو فنا اندر فنا

Marfat.com

تا عیاں وہ قدر ہو جو راز پنہانی سے ہے

حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادریؒ کا لقب مخدوم العصر اور تخلص عاشق، کریمی اور کریم ہے۔ آپ 20 ستمبر 1876ء کو گوجرانوالہ شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام حضرت خواجہ محمد عبداللہ عباسی قادریؒ تھا جو اپنے دور کے ولی کامل تھے۔ آپ کا نسبی تعلق عم رسول اللہ ﷺ (حضرت سیدنا عباسؓ) سے اور حسبی تعلق حضرت غوث الاعظمؒ سے ہے۔ آپ نے شاعری کا آغاز 1904ء میں کیا۔ آپ کی غزل میں تصوف کا رچاؤ، فکری پختگی سادہ بیانی، جذبات کی فراوانی اور غزل کا سلجھا ہوا روائتی اسلوب ہے۔ کیونکہ یہی آپ کے عہد کا متداول طرز اظہار تھا۔ فرماتے ہیں۔

کون سی مے کا حوالے میرے ساغر کر دیا؟
خود چھپایا اپنا چہرہ ہم کو مظہر کر دیا

☆☆☆

مسکن اصلی ہمارا تھا حریم کبریا!
لیک قسمت نے ہمارا حال دیگر کر دیا

☆☆☆

اس نشیمن میں ہمیں آنے کا کب آتا خیال
آدمؑ معصوم کو قدرت نے بے گھر کر دیا

☆☆☆

جب خدا نے کن کہا تھا، ہم وہاں موجود تھے
بے خودی نے نعرہ زن ہو کر قلندر کر دیا

☆☆☆

پردہ ہستی اگر اُٹھ جائے ہم سے اے کریم!

Marfat.com

پھر تو دیکھے گا کہ پر ساقی نے ساغر کر دیا

آپ تیس سال دربار قادریہ عالیہ (بازار خراداں، گوجرانوالہ) میں سجادہ نشین رہے۔

آپ کا وصال 31 اگست 1942ء کو ہوا اور اسی دربار میں مدفون ہیں۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے بیٹے صاحبزادہ محمد بشیر قادری عباسی سجادہ نشین ہوئے۔ 1985ء میں ان کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے صاحبزادہ شبیر کمال عباسی سجادہ نشین ہیں۔ جن کی علمی اور ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ انہی کے ذوق و شوق کے سبب حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادریؒ کی دوگراں قدر کتابیں ''میزان عشق'' اور ''گنج عرفان'' منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ابھی ان کا بہت سا کلام غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ جو بہت جلد منظر عام پر آ جائے گا۔ میں نے اس مضمون میں ان کے غیر مطبوعہ کلام ہی سے انتخاب دیا ہے۔

عشق حقیقی اور نفیٔ ذات، ان کی شاعری کے بنیادی حوالے ٹھہرے ہیں۔

ماسوا دلدار کے سب گنج زر بے سود ہے !

گر نہیں مقصود جاں ، رنج سفر بے سود ہے

☆☆☆

وہ نظر کیا خوب ہے جو دیکھتی ہے ذات کو

یار بنی کے سوا باقی نظر بے سود ہے

☆☆☆

حسن دل کی بات کیا ہے؟ یار سے ہے گفتگو !

راز دل کے ماسوا باقی خبر بے سود ہے

☆☆☆

عاشقانہ سوز دل سے ہے غزل جانِ کریم !

Marfat.com

گر نہ ہو سوز جگر ، لطف اثر بے سود ہے

''میزان عشق'' کے دیباچے میں جناب حفیظ تائب رقمطراز ہیں۔

''سلوک کے سفر میں مرشد کے وسیلے کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مرشد کی صحبت کے بے شمار روحانی فائدے ہیں بلکہ روحانی زندگی شروع ہی مرشد کی صحبت سے ہوتی ہے۔ جو بتدریج ترقی کرتی ہوئی اوج کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اسلئے شیخ (مرشد) کی صحبت کو روحانیت کی پہلی شرط قرار دیا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے ''احیاء علوم الدین'' میں لکھا ہے۔ ''جس کی رہنمائی کے لیے کوئی شیخ نہ ہو، اسے شیطان اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔''

خواجہ صاحبؒ اپنے دور کے صاحب سلوک ولی کامل تھے۔ جن کے دست حق پرست پر ہزاروں ہزار غیر مسلموں نے کلمہ توحید پڑھا اور ان کو اپنا سچا رہنما پایا۔ خواجہ صاحبؒ نے اشعار کی صورت میں بھی لوگوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جلوۂ محبوب حقیقی کے روشن لمحات کی آرزو مندی ان کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔

تو اس درویش کے قدموں میں رکھ سر
جو حق عشق میں مجنوں ہوا ہے

☆☆☆

ہوا محبوب کی رہ میں جو پامال
وہ بے شک عاشقوں میں اولیا ہے

☆☆☆

خیال یار ہے گر جان و دل میں
یہی ایمان باخوف و رجا ہے !
کریں موت سے پہلے ہی مر جا

Marfat.com

کہ آخر بس یہی رمزِ بقا ہے

امیر العصر حضرت خواجہ محمد بشیر عباسی قادریؒ "گنجِ عرفان" کے ابتدائیے میں لکھتے ہیں۔

"حضرت مخدوم العصرؒ نہ صرف ایک شیخ طریقت کی حیثیت سے ہی متعارف ہیں بلکہ آپ کی حیثیت بطور عظیم صوفی شاعر بھی مسلمہ ہے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو شعر کہنے کا ذوق بڑی فراخدلی سے عنایت فرمایا تھا۔ آپ نے اس عنایت کو صرف شعر کہہ کر اپنی وجدانی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعے طریقت کی راہ پر چلنے والوں اور فیض معرفت کے پیاسے لوگوں کو اس راہ کا رموز آشنا کیا ہے۔"

اسی کتاب میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر "جان پہچان" کے زیرِ عنوان کہتے ہیں۔

"حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادریؒ المتخلص بہ عاشق (کریم۔ کریمی) سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ محمد عمر عباسی قادریؒ اپنے دور کے صوفیائے کرام میں شریعت کے علم اور تصوف کے وسیع مطالعہ پر گہری نظر کے مالک ہوتے ہوئے اس راہ میں عوام کی بڑی رہنمائی کرتے ہیں۔"

خواجہ صاحبؒ کا ان شعرائے متقدمین کے سلسلہ تصوف سے انسلاک ہے، جن میں سے مولانا رومؒ، جامیؒ و سعدیؒ، مرزا مظہر جان جاناں، مرزا غالب اور خواجہ میر درد کے نام نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب کا پنجابی، فارسی اور اردو کلام ان صوفی شعرا سے کسی طرح بھی کم درجے کا نہیں، جن میں حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مادھولال حسینؒ، حضرت سلطان باہوؒ، بابا بلھے شاہ، پیر مہر علی شاہ، علی حیدر، ہاشم شاہ، وارث شاہ، میاں محمد بخش اور خواجہ غلام فرید کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

حضرت خواجہ محمد کریم اللہ عباسی قادریؒ کی شاعری میں عشق حقیقی کی وہ جلوہ سامانیاں ہیں کہ ہمہ وقت جس کے ورد کیلئے طبیعت مائل رہتی ہے اور جس کے اثرات قاری کے دل پر دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔

Marfat.com

لکھا ازلی مصور نے ہمارے دل کی تختی پر
قضا کی کلک سے اللہ اکبر باخطِ خوشتر

☆☆☆

خدا جانے اسی باعث نظر ہم کو جو آتا ہے
وہ مظہر ذات کا معلوم ہوتا ہے قدم تا سر

☆☆☆

جمالِ ایزدی ہی دیکھتا ہوں شیشہء دل میں
نگاہِ عاشقانہ جب پڑے اللہ اکبر پر

☆☆☆

عجب کیا چشم نابینا نہیں گر دید کے قابل
خدا بیں چشم پیدا ہو تو دیکھے چہرہء داور

☆☆☆

کریم اس لامکانی کو محیط زندگی رکھوں
کلاہ ودلق میں گاہے ، لباسِ فقر میں اکثر

خواجہ صاحبؒ کی غزل میں اہل دل (اہل خدا) کی روحانی واردات واقدار کی صداقت کا وہ والہانہ اظہار ہے جو قدم قدم قاری پر سوچ اور فکر کے در وا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے دل کو دنیاوی آلودگیوں سے اجتناب کی ترغیب دیتا ہے!

☆☆☆

Marfat.com

انا پرست شاعر

راسخ عرفانی

راسخ عرفانی کی شخصیت اور شاعری کو جو ذہنی اور فکری استحکام کی دولت فراواں میسر آئی وہ ان کا مضبوط دینی حوالہ اور تربیت کی استقامت ہے۔ان کے والد بلند مرتبہ عالم دین ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے پنجابی شاعر بھی تھے۔راسخ عرفانی کو شاعری ورثے میں ملی۔ تخلیقی سطح پر ان کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔طویل مدت کے ریاض اور مشق سخن نے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں ان کی نشست مخصوص کر دی ہے۔

اس سلسلے میں انہوں نے خود بھی مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

نظروں میں ہیں نئے بھی پرانے بھی راستے
آدھی صدی سے دشتِ ہنر کے سفر میں ہوں

ان کے مجموعہ کلام ''حرف گریزاں'' کے مقدمے میں ڈاکٹر وحید قریشی ان کی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''انہوں (راسخ عرفانی) نے دنیائے شعر میں جب شرکت کی، اس وقت اختر شیرانی کی شاعری زوروں پر تھی۔رومانی تحریک ان کے لئے نقطہ آغاز تھی۔اسی زمانے میں وہ علامہ اقبال کے کلام سے بھی متاثر ہوئے، سرمایہ ومحنت کے بارے میں اقبال اور احسان دانش کے خیالات کے علاوہ اشترا کی ادیبوں کا شجر سایہ دار پر کشش رہا۔ترقی پسند تحریک کی مقبولیت نے ان کے ہاں جس رنگ کو چمکانا شروع کیا۔اس میں دینی رجحان کے ہمرکاب مارکسی اصطلاحات بھی تھیں۔یہ وہ زمانہ ہے جب راسخ نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ترتیب دیا تھا۔اس زمانے میں بھی راسخ کے ہاں دینی

Marfat.com

لے کا غالب حصہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ کہ راسخ کے ہاں اشتراکی افکار محض اصطلاحات کی حد تک آئے ہیں اور ان کا اپنا نقطہ نظر بنیادی طور پر مذہبی ہے۔ وہ سرمایہ و محنت کے تصورات کو بھی اسلام اور قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں''

راسخ عرفانی کی شاعری میں صرف معنوی خوبیاں ہی نہیں، لفظی خوبیاں بھی موجود ہیں انہوں نے مشکل بلکہ سنگلاخ زمینوں میں بھی بعض بڑے واضح اور سلیس شعر کہے ہیں۔

نگاہ دار چمن ہیں ببول کے کانٹے
بہار میں بھی محافظ ہیں پھول کے کانٹے

☆☆☆

کوئے جفا میں کس کو نظارے کا ہوش تھا
ہر شخص کو تھے جان کے لالے پڑے ہوئے

☆☆☆

عجیب رت کے یہ منڈی میں پھل ہیں اے راسخ
چنا ہے ڈھیر سے جو بھی خراب نکلا ہے

☆☆☆

روایات نسب قربان راسخ
مرے بچوں کو انگریزی تو آئی

راسخ عرفانی کی عمر تک پہنچ کر اکثر شعرا فن کے اسرار و رموز پر تو بخوبی حاوی ہو جاتے ہیں اور الفاظ کی نوک پلک پر ان کے قلم کی گرفت بڑی مضبوط ہو جاتی ہے لیکن زندگی کے مظاہر و شواہد کے احساس و ادارک کا پہلو بہت حد تک مدھم پڑ جاتا ہے لیکن راسخ عرفانی کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے جو عمر کے کسی بھی مرحلے پر جذبہ و احساس کی حرارت سے اور مشاہدہ و مطالعہ کی دولت سے تہی دامن نہیں ہوتے۔

Marfat.com

خوں بیچ کر انا کا بجھائیں شکم کی آگ

ہم لوگ ایسے بے سروساماں نہیں ابھی

رئیس امروہوی نے روزنامہ ''جنگ'' لاہور کی اشاعت ۲۴ نومبر ۱۹۸۱ء میں راسخ عرفانی کی شاعری کا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

''راسخ عرفانی کے کلام میں رسوخ فن بھی ہے اور عرفان حقائق بھی بلاشبہ وہ اردو کے صف اول کے شاعر ہیں۔ الفاظ پر ان کی دسترس، استعاروں اور تشبیہوں پر ان کی گرفت اور اسالیب بیان میں ان کی تازہ کاری، یہ تمام خصوصیات درجہ تکمیل کو پہنچی ہوئی ہیں۔ جس چیز کو ضعف تالیف (بیان کا جھول) اور جس عیب کو شتر گربگی (کلام کی ناہمواری) کہتے ہیں جو اس عہد کی سخن وری میں عام ہے۔ راسخ کا کلام اس سے بالکل پاک ہے۔ الفاظ کی شگفتگی، معانی کی تہہ داری، مضامین کی تازگی اور موضوعات کی دلکشی ان کے کلام کا جوہر ہے''

اپنے عہد کے لمحہ موجود میں انسان کی محرومی و ناکامی، حسرت و یاس، غم و آلام، اپنوں کی بے وفائی، تصنع و ملمع کاری، ظاہر داری، بے قدری، شرافت کی رسوائی، ریاکاری اور فریب کاری ایک حساس ذہن بالخصوص شاعر کو سوچوں کی صلیب پر لٹکائے رکھتی ہے۔ اسے ان کاغذی پھولوں، رنگ بدلتے چہروں اور لمحہ لمحہ وفاداریاں تبدیل کرنے والوں سے پیار اور وفا کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی تو وہ اپنے افکار کو اشعار کے روپ میں ابنائے زمانہ کے سامنے لانے میں تامل کا اظہار نہیں کرتا۔

کاغذی پھول دریچوں میں سجا لو تم بھی

حکم ہے شہر کا پھر حسن سنوارا جائے

☆☆☆

کاغذی پھول بنے محفل نو کی زینت

ایسی رت آئی کہ گلداں بھی معطر نہ رہے

Marfat.com

راسخ عرفانی کی شاعری میں تازگی ہی نہیں بلکہ استادانہ اور فن کارانہ پختگی بھی دامن دل کو قدم قدم پر کھینچ لیتی ہے۔ مرزا غالب نے مضمون باندھا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا دشمن، غالب آسماں اپنا

راسخ عرفانی کا انداز دیکھئے۔

ہم کہاں کے تھے اہل فن راسخ
بغض رکھتا ہے آسماں ہم سے

غالب نے داد سخن لی۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد شوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

راسخ کہتے ہیں۔

یہ بھی تھا عہد وفا کا پاس ورنہ دوستو
کیسے پلکوں سے سر محفل کوئی چنتا نمک

مومن کا مشہور شعر ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

راسخ کا رنگ سخن دیکھئے۔

مجھ کو تنہائی کا احساس ہو کیسے راسخ
ساتھ ہر دور میں ہمزاد رہا ہے اپنا

استاد ذوق کا شعر ہے۔

Marfat.com

ہم ہیں وہ گرم رو راہ وفا جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

راسخ کہتے ہیں۔

سورج آیا جو سرپہ، سایہ بھی
چل دیا مجھ کو چھوڑ کر تنہا

آتش نے کہا تھا۔

خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہیں ہم آتش تدم
موم ہو جائے اگر آ جائے آہن زیر پا

راسخ نے جواب دیا۔

اگلے وقتوں ہی کے دیوانوں کا وہ اعجاز تھا
موم بن جاتی تھی جب زنجیر آہن زیر پا

راسخ عرفانی نے اپنے کلام اور دور حاضر کے عام رنگ سخن پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔

رنگ نو بھی محض ہے الفاظ کا ردوبدل
ورنہ اے راسخ مضامین غزل تازہ کہاں

☆☆☆

بل آیا ہے پیشانی ارباب سخن پر
شاید مری بندش میں کوئی جھول رہا ہے

☆☆☆

ہم نے شہر غزل میں اے راسخ
ہو کے بدنام شہرتیں پائیں

سید ضمیر جعفری، راسخ عرفانی کے نام (۸۶-۸-۱۷ کو) ایک خط میں لکھتے ہیں۔

Marfat.com

''راسخ عرفانی اس دور کے ان چند، شاید دو چار شعرا میں سے ہیں جن کا عروض ماضی کے ساتھ اور نفوذ مستقبل کے ساتھ چلتا ہے۔ ان کا فن پختہ اور شعر تازہ ہے جسم کے خلاف روح کی اتنی شدید اور بھرپور بغاوت ادب میں کم نظر آئے گی۔ ان کے شعر میں وہ قوت موجود ہے جو میدان جنگ میں زخمی سپاہی کے ہاتھ سے کمان گرنے نہیں دیتی۔''

راسخ عرفانی کا ایسے استاد شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ جو شاعری میں تنوع کے بھی قائل ہیں اور فن پر ان کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ سہیل اختر ''میری نئی بیاض'' کے مطالعہ خصوصی میں رقمطراز ہیں۔

''راسخ عرفانی کے سبھی شعری مجموعوں میں کلاسیکی رنگِ شاعری بڑا واضح اور نمایاں ہے۔ لیکن ''میری نئی بیاض'' کو پڑھ کر ایک عجیب حیرت کا احساس ہوتا ہے کہ ایک ایسا شاعر جس نے پچاس سال تک قدیم طرز سخن کو اپنائے رکھا۔ اب یوں اچانک کس طرح شاعری کی جدید قدروں اور رویوں کا علم بردار بن گیا اور کچھ اس انداز سے کہ ''میری نئی بیاض'' کو پڑھ کر کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ شاعر کبھی کلاسیکی راہوں پر بھی گامزن رہا ہوگا۔ یوں تو وقت کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کے انداز بیاں اور سوچ میں تبدیلی ایک قدرتی امر ہے لیکن یہ تبدیلی کبھی بھی اتنی واضح نہیں ہوسکتی۔ تعجب ہے تو اس بات پر کہ راسخ عرفانی نے قدیم روایات سے کچھ اس تحمل کے ساتھ دامن کشی اور شعوری گریز کیا ہے کہ شاعر کی قوت ارادی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔''

صنف شاعری میں غزل کو اپنی جان اور نعت کو اپنا ایمان کہنے والے راسخ عرفانی اپنے حسب نسب پر محبت اور فخر کے جذبات رکھتے ہیں اور ان کی متاع عزیز تھی۔

انا ہو زخمی تو اپنا لہو بھی ٹھکرا دوں
یہ سطر پہلی مرے درس کے نصاب کی ہے

راسخ عرفانی کہ سچ بولنا اور سچ سننا جن کی فطرت میں شامل تھا بری بات اور برے اشعار سن کر ان کے چہرے سے ناگواری اور تکدر کے آثار ہویدار ہوتے تھے۔ وہ کم آمیز تھے اور

Marfat.com

گوشہ نشینی ہی میں طمانیت قلب کی دولت میسر آتی تھی۔ ایسے اشعار میں شاعرانہ تعلی کی نہیں بلکہ ان کے ریاض فن کی غمازی ہوتی ہے۔

دینے والے کی دین ہے راسخ
عام جملہ کہوں تو شعر بنے

☆☆☆

استفادہ کرو میاں ہم سے
لوگ پاؤ گے پھر کہاں ہم سے

راسخ عرفانی بدلتی ہوئی قدروں سے خائف اور دم توڑتی تہذیب وثقافت پر ماتم کناں نظر آتے ہیں۔ اس دکھ کا ان کے اشعار میں بارہا اظہار ہوا ہے۔ ہوس زر، دوستوں اور رشتوں میں امارت کا پیدا کردہ فرق ان کے نزدیک انتہائی قابل نفرت اور ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے اور وہ پرانی تہذیب وثقافت کے علم بردار ہیں۔

کیا ملا بیٹوں کو تہذیبی فصیلیں توڑ کر
ایسا گھر بدلا کہ اپنا گھر پرایا گھر لگا

☆☆☆

مرے وقار نسب کا یہی تقاضا ہے
گروں نشیب میں پھر بھی کروں فراز کی بات

☆☆☆

شہر بے حس میں کون دیکھے گا
پھول نام ونسب کے شام ڈھلے

''المعارف'' لاہور میں محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں۔

''راسخ عرفانی کا شمار اردو کے مستند اور کہنہ مشق شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے شعر

Marfat.com

(اشعار) میں مشاہدہ بھی ہے اور پختگی بھی، گہرائی بھی ہے اور تجربہ بھی، حسن بھی ہے اور فن سخن وری پر عبور بھی، غرض وہ ہر لحاظ سے کامیاب شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو کر اصحاب ذوق سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ راسخ کی شاعری حقیقت کی ترجمانی اور واقعات کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے"

راسخ عرفانی عملی زندگی میں بے حد انا پسند، خوددار، صاف گو، پاک باطن، دیانت دار اور مخلص انسان تھے۔ انہیں اپنی ان خصوصیات کا شدت سے احساس بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی ذات ہی کو اپنا محبوب بنالیا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا محور ان کی ذات تھی۔

مدتوں میں نے حسینوں کی خوشامد کی ہے
جی میں آئی ہے کہ اب ناز اٹھاؤں اپنے

☆☆☆

میں اپنا درد اپنے آپ تک محدود رکھتا ہوں
تڑپنا جانتا ہوں، مجھ کو تڑپانا نہیں آتا

عاصی کرنالی اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں۔

"وہ (راسخ عرفانی) آج کے دور میں آج کا شعر کہہ رہے ہیں اور اپنی شاعری میں عصری مقتضیات و مسائل کو سمو رہے ہیں۔ بڑے فنکار کی یہی ادائے خاص اور یہی عصری بصیرت اس کی عظمتوں کے مینار بلند کرتی ہے اور اس کے نقش حیات کو تاریخ کی پیشانی پر ثبت کرتی ہے۔ چنانچہ مطالعے کے دوران میں یہ بات مجھ پر منکشف ہوتی رہی ہے کہ راسخ عرفانی کے یہاں اسلوب کی تازگی، خیالات و افکار کی تازگی، موضوعات کی تازگی الغرض فنی اور معنوی تازگی کا چمن لہلہا رہا ہے اور اہلِ ذوق بقدرِ توفیق اس کی سیر کر رہے ہیں اور اس کی کیاریوں سے گل ہائے تازہ چن رہے ہیں۔ ان کے یہاں لہجے کی انفرادیت اور موضوعات کا تنوع ان کی حسین و عظیم شاعری کے بنیادی تلازمے ہیں اور جو چیز ان کے شعروں کو بقا عطا کرتی ہے، وہ عصری مسائل کا شعور،

Marfat.com

عرفان اور ادارک ہے۔اور یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ جس جذبے یا احساس کا بھرپور ادارک ان پر ہوتا ہے۔اس کا اتنا ہی قوی ابلاغ ان کے قاری یا سامع پر ہوتا ہے“

راسخ عرفانی اپنی قادرالکلامی اور شگفتہ بیانی سے اردو شاعری کے ایوان میں تادیر گونجتے رہیں گے۔

زندہ اک عمر سے ہوں کوئے غزل میں راسخ
میری پہچان کوئی قریہ بے نام نہیں

پروفیسر اسرار احمد سہاوری ”ایک تصنیف لطیف“ میں راسخ عرفانی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہیں۔

”راسخ صاحب ایک نکتہ پرور اور عذب البیان شاعر ہیں۔ ان کی نکتہ پروری اور عذویت ابلاغ میں خلوص اور فکر وفن کے نگینے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ان کی فکر کی توانائی اور جذبہ کی صفت،فن کی رنگینی کے ساتھ مل کر قوس قزح کا رنگین اور نظر افروز کیف پیدا کر دیتی ہے۔راسخ عرفانی صاحب کا دوسرا حیرت انگیز کمال ان کی زبان و بیان پر قدرت ہے۔ایسا صاف وسادہ، بے عیب و دل کش طرز اظہار کم از کم آج کل کے شعرا میں بہت کم نظر آتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر لفظ، ہر تشبیہ، ہر استعارہ اور ہر اشارہ فکر و جذبہ کے ساتھ دست و گریبان ہو کر ابھرتا ہے اور ایسا جزو لاینفک بن کر سامنے آتا ہے کہ اس کا متبادل تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔اسی کو اصطلاح میں سہل ممتنع بھی کہتے ہیں۔راسخ عرفانی صاحب اپنے معتقدات اور اخلاقی و جمالیاتی قدروں کے وجود اور ان کے زمانی تسلسل کے قائل ہونے کے لحاظ سے بھی راسخ ہیں۔وہ اخلاقی اور ایمانی قدروں میں اضافیت کے قائل نہیں۔وہ بنیادی قدروں کو ناقابل تغیر حقائق تصور کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ان افسانوں کے صرف عنوان بدلتے رہتے ہیں۔حقائق واردات نہیں بدلتے۔وہ فطرت کے بنیادی تقاضوں کے مطابق ہی رہتے ہیں۔“

زلف و رخسار کے افسانے وہی ہیں لیکن

Marfat.com

وقت نے رنگ بدل ڈالے ہیں عنوانوں کے

راسخ عرفانی کی شاعری میں تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا گہرا شعور اور مطالعہ بھی ملتا ہے۔ جسے وہ بڑی دیانت داری سے الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی اسی صاف گوئی و صاف بیانی نے ان کے حلقہ احباب میں انہیں رسوائی کی زنجیریں پہنائیں لیکن انہوں نے سنت منصور کو چھوڑا نہیں۔ انہوں نے رسم کجکاہی ترک نہیں کی۔ جبینِ شاہی پر نمودار ہونے والی شکنوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ ایسے ہی آزاد منش وخود بیں تھے کہ غالب کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وانہ ہوا

راسخ خود بھی کہتے ہیں۔

یہ دربار شہی کیا ہے، مجھے راسخ سلیقے سے
خدا کے سامنے بھی ہاتھ پھیلانا نہیں آتا

راسخ عرفانی ایسے انا پرست وانا پسند شاعر ہیں کہ خلاف مزاج کسی بھی بات سے ان کا آئینہ دل میں بال آجانے کا ہمیشہ احتمال رہا۔ انہوں اپنی انا کو متعدد اشعار میں مختلف انداز میں باندھا ہے۔

جن سے ہوجائے مری روح انا بھی زخمی
ایسی سنگین نہ اے دوست سزا دے مجھ کو

☆☆☆

تو اس انا کے کھنڈر سے نکل کے دیکھ ذرا
ہمارا حال بھی گھر سے نکل کے دیکھ ذرا

☆☆☆

Marfat.com

خوں بیچ کر انا کا بجھائیں شکم کی آگ
ہم لوگ ایسے بے سروساماں نہیں ابھی

☆☆☆

غار عشرت میں گر کے اے راسخ
اوج پر ہے انا فقیروں کی

☆☆☆

راسخ دیار زر میں بلا کا تھا معرکہ
میں نے غنا میں چھپ کے انا کو بچا لیا

☆☆☆

تا کجا اپنی اپنی انا کوئی کسی پہ وارے
وصل توہین کا موجب ہو تو فرقت بہتر

☆☆☆

راسخ کھنڈر سے گھر میں بھی اونچی انا رہے
در پر لگانا نام کا پتھر نہ بھولنا

☆☆☆

نہ پڑنے دی انا پر دھول راسخ
سراب زر میں گو برسوں رہے ہیں

☆☆☆

انتہا ہے انا پرستی کی
عین طوفان میں ناخدا سے ٹھنے

☆☆☆

Marfat.com

کس مقام پہ فائز تھا کتنے مونس تھے
بنام جرم ''انا'' دار پر اکیلا ہوں

☆☆☆

زخمی زباں تھی اور تھے ہونٹوں پہ آبلے
راسخ خموش پھر بھی نہ مجھ سے رہا گیا

اخذ واستفادہ:۔

۱۔ مقدمہ ''حرف گریزاں''	از ڈاکٹر وحید قریشی
۲۔ ابتدائیہ ''ہواؤں کے بھنور''	محسن احسان
۳۔ سہ ماہی ''فروغ'' گوجرانوالہ	راسخ عرفانی نمبر
۴۔ روزنامہ ''جنگ'' لاہور	(۲۴ نومبر ۸۱ء)
۵۔ روزنامہ ''امروز'' لاہور	(۲۱ جولائی ۸۶ء)
۶۔ روزنامہ ''جسارت'' لاہور	(۲۴ اکتوبر ۸۶ء)
۷۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور	؟
۸۔ ماہنامہ ''المعارف'' لاہور	(جنوری ۸۳ء)
۹۔ ماہنامہ ''محفل'' لاہور	
مطالعہ خصوصی ''میری نئی بیاض''	سہیل اختر
۱۰۔ ''راسخ عرفانی اور رنگ تغزل''	نظیر لودھیانوی
۱۱۔ ''ایک تصنیف لطیف''	اسرار احمد سہاوری
۱۲۔ ''ہواؤں کے بھنور'' ایک تاثر	عاصی کرنالی
۱۳۔ ضمیر جعفری کا ایک مکتوب	

Marfat.com

اقبال ساجد اور اس کا اثاثہ

اقبال ساجد اتنا غیر اہم شاعر نہیں کہ اسے اتنی آسانی سے فراموش کر دیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے زندگی میں نظر انداز کیا جاتا رہا اور مرنے کے بعد بھی اس کے بارے میں لکھنے والوں پر بے حسی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ سماجی سطح پر اگرچہ ناکامیاں اس کا مقدر تھیں لیکن ادبی سطح پر اس کے فن کا سکہ رواں تھا۔ اقبال ساجد کی شاعری کے سکہ رائج الوقت پر کتنے ادبی سوداگروں اور نظام سقوں نے اپنا نام کندہ کروانے کی کوششیں کیں اور صلے کے طور پر اس کا چاک دامن بھی رفو نہ کر سکے۔

اقبال ساجد نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا۔

''انہوں نے بتایا کہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی بہترین غزلیں انہوں نے لکھ کر دوسروں کو دے دیں اور بھیک کے سہارے کئی اصحاب صاحب دیوان ہو گئے'' 1

اس ''کاروبار'' میں اقبال ساجد شعوری طور پر ملوث تھا کہ یہ اس کی ضرورت بھی تھی۔ اسے اس بات کا ادارک بھی تھا کہ ''غزلوں'' کا فروخت کرنا، اس کیلئے سود مند نہیں۔

یہ ترے اشعار تیری معنوی اولاد ہیں
اپنے بچے بیچنا اقبال ساجد چھوڑ دے

شعر و سخن کی دنیا میں اس نے نئے نئے ''کھلاڑی'' تیار کرنے کی کوشش تو کی لیکن ان ''کھلاڑیوں'' میں اتنی جان نہ تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکتے۔

یہ بھی اقبال ساجد کا وہم ہی تھا

عزتیں ان کو ملیں جن کی کوئی عزت نہ تھی

Marfat.com

ہم کہ رسوائی کا باعث ہوگئے فن بیچ کر

یا پھر

روشن ہوئے ہیں لوگ مرا فن خرید کر

اقبال ساجد کو اس کا اعتراف بھی ہے۔

میں نے لوگو! اپنی سوچوں کو سمگلنگ آپ کی
جرم جب عائد ہوا انکار بھی کرنا پڑا

☆☆☆

ضرورت ہی لئے پھرتی ہے ہم کو دربدر ورنہ
ہم ان میں سے نہیں جو جستجوئے زر میں رہتے ہیں

☆☆☆

میرے الفاظ ہی کر دیتے ہیں نیکی ظاہر
شعر کی بھیک جنہیں میں نے چھپا کر دی ہے

☆☆☆

مفت میں تقسیم کی ساجد متاعِ شاعری
جس نے اپنا قرب اپنایا وہ شاعر ہو گیا

اقبال ساجد کا قرب اپنانے والا شاعر ہوا یا نہ ہوا ہو لیکن بدنامی کا داغ ضرور اس کی پیشانی پر ثبت ہو گیا! اقبال ساجد کا ''اثاثہ'' جواز جعفری نے بڑی محبت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے اقبال ساجد کے شخصی اور ادبی پہلوؤں کا اس نے جو احاطہ کیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں جواز جعفری کا مقالہ ''عہد جدید تر کا نمائندہ کون ہے؟'' اقبال ساجد کی داخلی اور خارجی حسیت اور اس کی تخلیقیت کی تفہیم کا ایک معتبر ذریعہ اور شاعر موصوف سے اس کی محبتوں اور عقیدتوں کی ایک متحرک تصویر ہے۔

Marfat.com

''جدیدیت'' کے جو دھنک رنگ اس صدی کی چھٹی دہائی میں ادب کے افق پر رونما ہوئے، انہوں نے بہت سے روایت شناسوں کی توجہ اپنی جانب منعطف کرلی۔ جدیدیت کی اس لہر کی بدولت جو شعرا سامنے آئے، ان میں شکیب جلالی، ماجد الباقری، شہزاد احمد اور ظفر اقبال وغیرہ کا نام نمایاں ہے۔

رشید امجد رقم طراز ہیں:

''ظفر اقبال اور شہزاد احمد کی نسبت جدید پود شکیب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ظفر اقبال اور شہزاد احمد کے یہاں جو فکری اور نفسیاتی سطح بنتی ہے۔ اس تک پہنچنے اور اسے اپنانے کے لئے جس جدید وسیع مطالعے، تجزیئے اور تخلیقی اپج کی ضرورت ہے، وہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ جبکہ شکیب کے یہاں کھیل لفظی اور تصویری ہے، چنانچہ بہت سے نئے اور پرانے شاعروں نے اس کا لب و لہجہ، اسلوب، مضامین حتیٰ کہ لفظوں تک کو استعمال کیا ہے۔ اس کے باوصف ان میں سے ایک بھی شکیب کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکا، کہ شکیب کے یہاں اس ساری لفاظی اور تصویروں میں بہر حال بٹی ہوئی شخصیت کا ایک تخلیقی عمل کارفرما ہے، جو ان کا بنیادی تنازع بھی ہے اور ان کی جیتی جاگتی شخصی زندگی کا المیہ بھی جو ان کا تتبع کرنے والوں کے یہاں نظر نہیں آتا۔ شکیب نے لفظوں کو علامت نہیں بنایا۔ ان کا تتبع کرنے والے بھی اس عمل سے خالی ہیں بلکہ ان کے یہاں ایک معنی میں بار بار کے استعمال سے لفظ مردہ بے جان اور بے اثر ہو گئے ہیں۔ شکیب سے متاثر ہونے والوں میں افضل منہاس، مرتضیٰ برلاس، سیف زلفی، اختر امام رضوی اور پرانے شاعروں میں احمد ندیم قاسمی شامل ہیں۔ یہ لوگ شکیب سے شعوری طور پر متاثر ہیں'' 2

اقبال ساجد نے بھی اپنے انٹرویو میں اس بات کی تصدیق کی ہے:

''عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے بیشتر شعرا فیض، قاسمی اور فراز سے متاثر ہیں، لیکن اس کے بارے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں (اقبال ساجد) نے کہا یہ بالکل غلط ہے کہ نئی نسل ان شعرا سے متاثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئے شعرا کسی حد تک شکیب جلالی

Marfat.com

سے متاثر ہیں'' (نمبر۳)

نئی غزل میں تمثیل کاری، پیکر تراشی، استعارہ سازی، تراکیب کی ندرت، معاشی اور معاشرتی کرب، طنز کی نشتریت اور اپنی ہی ذات سے ٹکراؤ کی باغیانہ روش ایک تحریک کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ اس حوالے سے رشید امجد نے ''نیا ادب'' میں جو تجزیہ پیش کیا ہے، وہ مختصراً یوں ہے۔

'' دیہاتی پس منظر کو خام مواد کے طور پر استعمال کرنے والے غزل گوؤں میں وزیر آغا، شکیب جلالی اور ناصر شہزاد نمایاں ہیں۔ شکیب جلالی اپنے کینوس پر لہو رنگ تصویریں بناتے ہیں۔ یہ جذباتی پیکر قاری کو اپنی طرف متوجہ تو فوراً کر لیتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ ان میں فکری کمی کا احساس بھرنے لگتا ہے۔ وزیر آغا کے یہاں رنگ مدہم ہیں کہ رنگوں کی بجائے انہوں نے فکری پہلوؤں پر یادہ توجہ دی ہے۔ دیہاتی پس منظر کے تیسرے شاعر ناصر شہزاد کا طریقہ کار اول الذکر دونوں سے نلف ہے۔ ان کے یہاں پس منظر مخصوص MYTH کے توسط سے اجاگر ہوتا ہے۔

شہزاد احمد سچائی کے متلاشی ہیں، یہ سچائی منافقتوں اور کالکوں کے پردے میں چھپی دئی ہے۔ اس پردے کو چاک کرنے کا عمل شخصیت کے بٹوارے کا اعلان نامہ بھی ہے۔ اندر کے ''میں'' اور دوسری ذات کو تجسیمی صورت میں پیش کرنے کا رجحان ظفر اقبال ماجد الباقری، شوکت خواجہ اور ابرار اعظمی وغیرہ کے یہاں نمایاں لہر ہے۔ ظفر اقبال کے یہاں ذات کے حوالہ سے چیزوں کو دیکھنے کا رجحان غالب ہے۔ ماجد الباقری کے یہاں ایک بڑا المیہ تصویری شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ ذات کی تشخیص کا مرحلہ ہے، کیونکہ ذات خود کو خارج میں Adjust نہیں کر پاتی۔ چنانچہ اس مفاہمت کیلئے جو ٹکراؤ ہوتا ہے وہ اس المیہ کی بنیادی لہر ہے۔ ماجد کی تصویروں میں یہ زخمی ذات زندہ رہنے کی مفاہمت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس کے ساتھ ظاہراً ایک شخصیت دوسری شخصیت کے ساتھ نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے کہ اپنا وجود ہی لاش بن کر ذات کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔

Marfat.com

''ذات کی تقسیم کا عمل شہری معاشرہ کے پس منظر میں پرکاش فکری، اقبال ساجد، وہاب دانش، محمد علوی، عادل منصوری اور سلیم شاہد وغیرہ کے یہاں ظاہر ہوا ہے۔ منیر نیازی، ماجد الباقری اور ناصر شہزاد کا تخلیقی ماخذ جنگل ہے ۔ بٹی ہوئی شخصیت کے تین اور شاعر اقبال ساجد، محمد علوی، اور عادل منصوری ہیں۔

''اقبال ساجد کے یہاں بے صدا آوازوں کو سننے اور اس احساس میں بے بسی کے عالم میں آئینہ کے سامنے اپنے روپ کو پاگل دیکھنے کا کرب بنیادی تنازع ہے۔ مرکزی تصویر ایسے شخص کی ہے جو اپنی ذات پر اعتماد ہی نہیں کھو بیٹھتا بلکہ اپنے عمل کے بارے میں بھی مشکوک ہے۔ یہ تشکیک اوپری سطح پر نامرادی کا دائرہ کاٹتی ہے لیکن اندرونی پرت میں چنگاری کی طرح دبی ہوئی حظ اٹھانے کی تمنا سلگتی نظر آتی ہے۔ محمد علوی کے یہاں یہ چنگاری الاؤ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اقبال ساجد اور محمد علوی کے یہاں ریزگی کا عمل مسلسل جاری ہے لیکن عادل منصوری اس ریزگی کو سمیٹ کر پھر سے نئے انسان کا ہیولیٰ بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تینوں شاعر اقبال ساجد، محمد علوی اور عادل منصوری اپنی اپنی ذات کے نوحہ گر ہیں۔'' (نمبر۴)

اقبال ساجد نے اپنی ذات کی نوحہ گری ہی نہیں کی بلکہ اس کی ذات ایک معروضی تجربے کی صورت میں ایک نیا استعارہ بن کر اس کی شاعری میں طلوع ہوئی ہے۔ ۔

مرے ہی حرف دکھاتے تھے میری شکل مجھے
یہ اشتہار مرے روبرو بھی ہونا تھا

☆☆☆

زہر جب کھانے لگوں، یہ سوچ آئینہ بنے
مرگیا میں تو مرے بچوں کا جانے کیا بنے؟

اقبال ساجد کو ''جدیدیت'' نے خون تھوکنے کے سوا کیا دیا؟ تاہم اس کے یہ اشعار کسی حوالے سے بھی کم مایہ نہیں ہیں۔

Marfat.com

پرانی سمت مڑے گا نہ کوئی بھی ساجد
یہ عہد نو نہ بہے گا قدیم دھارے میں

☆☆☆

ہے اتحاد کا موسم جدیدیو! اٹھو
لگاؤ نعرہ، قدامت نواز کچھ بھی نہیں

☆☆☆

وہ لوگ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں
ہمیں جو کہتے ہیں جدت طراز کچھ بھی نہیں

☆☆☆

پرانے فن کو نئے پن نے کردیا مسمار
کہ ماضی ہار گیا اور حال جیت گیا!

☆☆☆

سینے سے پھر لگائیں گے تجھ کو پرانے لوگ
ساجد جدیدیت کو تو فن سے نکال دے

☆☆☆

دفن ہو جائے گا تیرا دینِ جدت ایک دن
شاعری کا اکبرِ اعظم نہ بن، ضد چھوڑ دے

☆☆☆

ساجد ادب میں اور کرنسی نہ تو چلا
افراط کی شکار یہ جدت بہت ہوئی

''اثاثہ'' میں شامل کئی غزلوں کے خوبصورت شعر غالباً سہو کتابت کی نذر

Marfat.com

ہو گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ نمبر ۲۳ کی غزل میں یہ شعر شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔

یہاں کے لوگ تو خوشبو سے خوف کھاتے ہیں
گلاب نقش کہاں راہ گیر چھوڑ گیا 5

صفحہ نمبر ۱۰۸ پر جو غزل ہے، اس میں یہ شعر نہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بازار ویراں ہو گئے
جاگتی گلیوں میں سناٹے سفر کرنے لگے 6

صفحہ ۱۶۸ کی غزل میں یہ شعر شامل نہیں۔

سطحِ ظاہر سے کوئی فرق نہ باطن میں پڑا
روح جامد نہ کبھی جسم کے پالے سے ہوئی

اقبال ساجد کے بہت سے اشعار زبانِ زدِ عام ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کی ان غزلوں کے اشعار ہیں جو ''اثاثہ'' کی زینت نہیں بن سکیں۔ یہ شعر دیکھئے۔

بہت مشکل ہے ساجد خود کو اب معیار میں رکھنا
در و دیوار میں رہنا، قدم بازار میں رکھنا

☆☆☆

کبھی مصروف آزادی مجھے ہونے نہیں دیتے
مرے بچے مجھے فٹ پاتھ پر سونے نہیں دیتے

☆☆☆

زہر جب کھانے لگوں، یہ سوچ آئینہ بنے
مر گیا میں تو مرے بچوں کا جانے کیا بنے؟

☆☆☆

لگا کر چھابڑی غزلوں کی ہر بازار میں رکھنا

Marfat.com

ان غزلوں کو دیکھئے یہ بھی ''اثاثہ'' کا درواہونے کی منتظر ہیں۔

خود فنا ہوجائے گا، شہکار لافانی نہ کر
رائیگاں جائے گی محنت، خون کو پانی نہ کر

☆☆☆

آنکھ کے کوزے میں بند اشکوں کی طغیانی نہ کر
قیدیوں کی اتنی سختی سے بھی نگرانی نہ کر

☆☆☆

پچھلی باتیں یاد کرنے سے بھلا کیا فائدہ
اب کتابِ سنگ کی اوراق گردانی نہ کر

☆☆☆

شام کے پنجرے میں آئے گا پرندہ دھوپ کا
روشنی کے گھر میں سائے کی نگہبانی نہ کر

☆☆☆

میرے ہاتھوں کی لکیریں پہلے ہی کچھ کم نہیں
گنجلک شکنوں سے تو بھی اپنی پیشانی نہ کر

☆☆☆

دائروں کی سطح پر اتنا نہ نقطوں کو ابھار
اس قدر بھی اہتمام شعلہ سامانی نہ کر

☆☆☆

ٹھنڈے دل سے غور کر جذبات کی رو میں نہ بہہ
... بھی ضد چھوڑ دی ہے تو بھی من مانی نہ کر

Marfat.com

آہ بھر کر کہر کی چادر میں کرنوں کو نہ باندھ
آس بخ بستہ نہ کر یادوں کو برفانی نہ کر

☆☆☆

میں نے تو ساجد کسی کا بھی برا چاہا نہ تھا
لوگ کہتے تھے مگر ، نیکی کی قربانی نہ کر

قبال ساجد کی یہ غزل بھی قابل مطالعہ ہے

دل کو دانا کہوں کہ سودائی
بھیڑ میں ڈھونڈتا ہے تنہائی

☆☆☆

میں وہ ناداں کہ شہر طفلاں میں
بیچتا پھر رہا ہوں دانائی

☆☆☆

گفتگو کا ہنر نہ کام آیا
عقل کی جیب کٹ گئی بھائی

☆☆☆

یہ بتا شہرتوں کی منڈی میں
بک گئی کیسے تیری رسوائی

☆☆☆

رک کے چلنا بھی ہے دلیل سفر
حوصلوں کی نہیں ہے پسپائی

☆☆☆

Marfat.com

پیار کر اس قدر سمندر سے
خود صدف لے کے آئے گہرائی

☆☆☆

میں اسے کیسے مان لوں دریا
جس نے ہونٹوں کو پیاس پہنائی

☆☆☆

کون سا گیت مر گیا ساجد
سسکیاں بھر رہی ہے شہنائی 9

اقبال ساجد کا ''اثاثہ'' تسامحات سے مبرا نہیں۔ اس کی پروف ریڈنگ بھی دقتِ نظر کی متقاضی تھی۔ ''میرا'' اور ''مرا'' اور ''پہ'' میں بعض جگہوں پر امتیاز نہیں رکھا گیا۔ صفحہ نمبر ۷۴ پر شبنم شکیل کے مقطع کے ساتھ جو غزل ہے، اسے شامل اشاعت نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

''اثاثہ'' کے صفحہ نمبر ۶۲ پر مصرع ہے — خواہش ہے بڑھائی کی تو اندر سے بڑا بن

اصل مصرع یوں ہے — خواہش ہے بڑائی کی تو اندر سے بڑا بن

صفحہ نمبر ۲۷ پر — گڑھے مردوں نے اکثر زندہ لوگوں کی قیادت کی

یہاں ''گڑے مردوں'' ہونا چاہیے۔

اسی صفحے پر شعر ہے — اگا نہ سبزہ تو اس سے اجاڑ گھر کی منڈیر
پلاسٹک کی ہری بیل سے سجائی دیکھ

اس کا مصرع اولی یوں ہے — اگا نہ سبزہ تو اس نے اجاڑ گھر کی منڈیر

صفحہ نمبر ۹۹ پر جو مصرع ہے وہ پڑھیے۔
اس میں تھا قحط حوصلہ مجھی میں کی تھی صبر کی
یہاں ''مجھی میں'' کی بجائے ''مجھ میں'' ہے۔

Marfat.com

اسی صفحے پر ''نقوش لاہور، صفحہ ۶۱۲ ہے۔ نمبر، مہینہ اور سال غائب ہے۔

صفحہ نمبر ۱۰۰ پر غزل کا شعر ہے اور صفحہ نمبر ۱۰۲ پر غزل کا مقطع ہے۔

صفحہ نمبر ۱۰۱ پر مصرع ہے: تجھ میں ہے یہ کمال کہ میں بے کمال ہوں

مصرع یوں ہے: مجھ میں ہے یہ کمال کہ میں بے کمال ہوں

صفحہ نمبر ۹۳ کی غزل میں پہلے تین شعروں میں ردیف ''بہت مہنگی پڑی'' ہے باقی تین شعروں میں ''بڑی مہنگی پڑی'' ہے۔

صفحہ ۱۲۰ پر متفرقات کے زیر غور عنوان جو دو شعر ہیں۔ وہ صفحہ نمبر ۱۲۸ اور نمبر ۱۶۹ کی غزل میں شامل ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۳۰ پر مصرع ہے: دنیا کے ادب میں ہے ترا سکہ رواں لکھ

اصل مصرع یوں ہے: دنیائے ادب میں ہے ترا سکہ رواں لکھ

صفحہ نمبر ۱۳۱، شمارہ ۵۔۶، اپریل مئی ۱۹۸۲ء پرچے کا نام ندارد۔

صفحہ نمبر ۱۶۱ ''نوائے وقت'' تاریخ، مہینہ، سال غائب۔

صفحہ نمبر ۱۶۵ ''اپنی زمین'' ماہ و سال نہیں۔

صفحہ نمبر ۱۹۹ ''نقوش'' جنوری ۱۹۲۹ء، اقبال ساجد کی پیدائش سے دس سال پہلے کی تاریخ جبکہ ''نقوش'' قیام پاکستان کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔

صفحہ نمبر ۱۰۹ پر شعر ہے۔

اب پڑھے بھی ساجدؔ کے بیماری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے

مصرع اول یوں ہے۔

اب پڑھے لکھے بھی ساجدؔ کے بیکاری سے تنگ

جبکہ ''عظیم آباد ایکسپریس'' میں چھپا ہے۔

اب تو ساجدؔ۔ کے آخر اپنی بیکاری سے تنگ

صفحہ نمبر ۱۴۹ پر مصرع ہے

شب گردہوں ایسا ہے جسے راہ دکھانے

اصل میں یوں ہے

شب گرد ہوں ایسا کہ جسے راہ دکھانے

Marfat.com

صفحہ نمبر ۱۸۴ پر دیکھئے — اصل نظر کے واسطے علم کا باب ہو گیا

اس کی درست صورت یہ ہے — اہل نظر کے واسطے علم کا باب ہو گیا

صفحہ نمبر ۱۸۶ پر مصرع ہے۔ — اک کھلی سڑک پہ یہ نوبت بھی آئے گی

اس کا وزن یوں پورا ہو گا — اک دن کھلی سڑک پر یہ نوبت بھی آئے گی

صفحہ نمبر ۲۱۲ پر مطلع کا مصرع اولیٰ ہے: — کیا ملا اقبال ساجد جدتِ فن بیچ کر

صفحہ نمبر ۲۳۲ پر یوں لکھا ہے — کیا ملا اقبال ساجد ندرتِ فن بیچ کر

صفحہ نمبر ۲۱۳ پر یہ شعر پڑھیے

دوسروں کو اپنی ویرانی کا کیوں الزام دوں
آپ ہی صحرا خریدا اس نے گلشن بیچ کر

مصرع ثانی کی درست صورت یہ ہے۔ — آپ ہی صحرا خریدا میں نے گلشن بیچ کر

اقبال ساجد کی طرح آج بھی بہت سے تخلیق کاروں کو یہ شکایت ہے۔

سینکڑوں قیمتی پرچوں میں چھپا میرا کلام
ہوئی پے منٹ تو اک آدھ رسالے سے ہوئی

(نمبر:۰)

مطالعات:

۱۔ اقبال ساجد سے انٹرویو از رضوان احمد
روزنامہ "عظیم آباد ایکسپریس" پٹنہ (بھارت) ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء

۲۔ "نیا ادب" از رشید امجد مطبوعہ ۱۹۶۹ء (1969)

۳۔ اقبال ساجد سے انٹرویو، رضوان احمد، ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء

۴۔ "نیا ادب" از رشید امجد۔

۵۔ "اوراق" جنوری، فروری ۱۹۸۰ء

۶۔ "عظیم آباد ایکسپریس" پٹنہ، ۲۰ مئی ۱۹۷۹ء

Marfat.com

۷۔ ''فنون'' اپریل مئی ۱۹۷۴ء

۸۔ ''اوراق'' سالنامہ و غالب نمبر اپریل ۱۹۶۹ء (1969)

۹۔ ''اوراق'' جنوری، فروری ۱۹۸۰ء

۱۰۔ ''اثاثہ'' اقبال ساجد، مطبوعہ اکتوبر ۱۹۹۰ء

☆☆☆☆☆

Marfat.com

میرے بزرگ میرے ہم عصر

ڈاکٹر وفا راشدی صاحب کے خامۂ عنبر فشاں نے قرطاس ادب پر وہ گل ہائے رنگ رنگ کھلائے ہیں، جن کی مہک عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ادب کی مستقل اہمیت کی اقدار کو اپنے تحقیقی، تنقیدی، تالیفی اور تخلیقی موضوعات کا قابل اعتبار حصہ بنایا ہے۔ وہ اس دشت ہمت شکن کی سیاحی میں گذشتہ ساٹھ سال سے، بڑی استقامت سے مصروف و مشغول ہیں۔ اس کہن سالی میں بھی ایک عزم جواں کے ساتھ وہ مصروفِ تصنیف و تالیف ہیں۔ تھکن کا نام شاید ان کے لغت میں ہے ہی نہیں۔

ڈاکٹر وفا راشدی صاحب کی اب تک منظر عام پر آنے والی تالیفات و تصنیفات کو دیکھیں تو ان کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔

1۔	جہانِ رنگ و بو	1945ء	2۔	پیام نو	1947ء
3۔	بنگال میں اردو،	1955ء	4۔	چاند تارے	1958ء
5۔	کیف و عرفان،	1961ء	6۔	سنہرا دیس	1964ء
7۔	اردو میں قومی شاعری	1966ء	8۔	خالد ایک نیا آہنگ	1977ء
9۔	آہنگ ظفر	1982ء	10۔	سحرِ حلال	1985ء
11۔	مہران نقش	1986ء	12۔	حیاتِ وحشت (دوسرا ایڈیشن)	1993ء
13۔	اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ	1994ء			
14۔	میرے بزرگ میرے ہم عصر	1995ء			

Marfat.com

ڈاکٹر وفا صاحب کی ان کتابوں کے موضوعات کا دائرہ کلکتے اور مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے لے کر پنجاب اور سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔

موخر الذکر کتاب ''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' جو آتی تو شخصیت نگاری کے ذیل میں ہے، لیکن خاکہ نگاری کے تناظر میں بھی اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان خاکوں میں رنگ، ڈھنگ اور آہنگ وفا صاحب کا اپنا ہے۔ یہ خاکے آج کی بے راہ رو نسلِ نو کے لئے لمحہ فکریہ مہیا کرتے ہیں، جو اپنے بزرگوں کے آثار کی عظمتوں سے بیگانہ اور لاتعلق ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ خاکے، جن میں متنوع رنگ ہیں، دینی، سیاسی، علمی اور ادبی شخصیات کی فکری زندگی کا ایک گراں بہا را ثاثہ ہیں۔

جن شخصیات پر ڈاکٹر وفا راشدی صاحب نے اپنی محبتوں کے انمول خزانے نچھاور کیے ہیں۔ وہ اپنی اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنے اپنے دائرہ کار میں ایک معتبر اور منفرد حوالہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر ہمیشہ شخصیت کی سیرت کے روشن پہلو ہی رہے ہیں۔ ان شخصیات میں سے انہوں نے کسی بھی شخصیت کے کسی تاریک پہلو کی طرف معمولی سا اشارہ تک نہیں کیا۔ یہی ان کی شخصیت نگاری کی سب سے اہم خوبی ہے۔ ورنہ یار لوگوں نے خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کی آڑ میں اچھے بھلے انسانوں کو بھرے بازار میں ننگا کر کے کھڑا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تین سو مضامین میں سے صرف چھتیس شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' میں فرمایا ہے اور زمانی ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، علامہ آرزو لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، علامہ ناطق لکھنوی، علامہ سیماب اکبر آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، حمید عظیم آبادی، افسر صدیقی امروہوی، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، سید الطاف علی بریلوی، علامہ جمیل مظہری، سلیم اللہ فہمی ماہر القادری، ڈاکٹر ممتاز حسن احسن، رضا مظہری، حمید جالندھری،

Marfat.com

ضیاء اسلام پوری، حفیظ ہوشیار پوری، شہاب الدین رحمت اللہ، میرزا ادیب، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، آغا شورش کاشمیری، ڈاکٹر شان الحق حقی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، صبا متھرادی، حکیم محمد سعید، شہاب دہلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، اقبال حیدری۔

''ان مضامین سے ہماری گذشتہ نصف صدی کی ادبی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ سامنے آتی ہے۔ جو کلکتہ اسکول سے لے کر ڈھاکہ لاہور اور کراچی تک محیط ہے یا یوں کہیے کہ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو کر ڈھاکہ یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور ہمدرد یونیورسٹی تک کا منظر پیش کرتی ہے۔ اس تاریخ میں دبستانِ وحشت سے لے کر دبستانِ دلی اور دبستان لاہور کے شعروادب کا چرچا بھی ہے اور سیماب اکبرآبادی کی اصلاحِ سخن اور سلسلہ تلامذہ کا تذکرہ بھی''

(ڈاکٹر وفا راشدی کا تصنیفی سفر، از مرزا نسیم بیگ ''ماہِ نو'' نومبر 95ء صفحہ 43)

ڈاکٹر وفا صاحب نے اپنے دل کی باتیں بھی کھل کر ''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' کے ورق ورق پر پیش کی ہیں۔ پاکستان میں تعلیمی انحطاط کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں تعلیم کا معیار انتہائی تشویش ناک حد تک گر چکا ہے۔ اساتذہ وطلبہ میں بے چینی و بے یقینی کے احساسات در آئے ہیں۔ تعلیمی بحران کا بنیادی سبب متعلقہ اشخاص کی بے حسی و بے دردی اور ناقص نظام تعلیم ہے۔ اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کی سب سے زیادہ ذمہ داری براہِ راست ان اربابِ اختیار پر عائد ہوتی ہے جو اپنے فرائض قومی و منصبی کی بجا آوری اپنی ذات اور STATUS کے MAINTENANCE میں ساری توانائی صرف کر دیتے ہیں۔ انہیں نہ تو تعلیم سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ہی قوم کے نونہالوں کے مستقبل کی فکر''

(صفحہ 241)

Marfat.com

ڈاکٹر وفا صاحب نے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی، اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔

''جب میں سنِ شعور کو پہنچا، برصغیر میں نوح ناروی، جلیل مانک پوری، سیماب اکبرآبادی، بے خود دہلوی، احسن مارہروی، ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی اور وحشت کلکتوی جیسے اساتذہ سخن کا طوطی بول رہا تھا۔ جدید شعرائے کرام میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، احسان دانش اور ماہر القادری کے نغمات لطیف سے ساری فضا جھوم رہی تھی'' (صفحہ 164)

''میں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں دیکھا کہ کلکتہ، لاہور، دلی، لکھنو، حیدرآباد دکن اور آگرہ میں اردو کے لاتعداد رسالے شائع ہوتے تھے اور سب سے زیادہ کلکتہ کے بک اسٹالوں پر فروخت ہوتے تھے۔ کلکتہ اس وقت ایک اہم ادبی مرکز تھا، ہمایوں، عالم گیر، نیرنگ خیال، خیام، مخزن، سب رس کے علاوہ نگار اور شاعر بھی کلکتہ کے کتب خانوں اور ادبی شخصیات کے ہاں نظر آتے تھے۔''

''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' کے مضامین میں جن ستر سے زائد رسائل و جرائد کا تذکرہ آیا ہے۔ ان پر علیحدہ تحقیق کی راہ نکلتی ہے۔ ان میں سے چند پرچوں کے نام ملاحظہ فرمایئے۔

نظام، خیام، شمس، الہلال، دل گداز، کامریڈ، ہمدرد، معیار، ادیب، مخزن، اردوئے معلی، جدید اردو، احسن، شاعر، ہمایوں، عالم گیر، نیرنگ خیال، جادو، ندیم پٹنہ، ندیم، ڈھاکہ، اختر، خیالستان، آگہی کتابی دنیا، نیرنگ عالم، المصباح، البلاغ، جامِ جم، تنویر، گل رنگ، خاور، مصنف، فطرت، سہیل، کائنات، آج کل، الزبیر، صریر خامہ، اردو نامہ، مخزن (جالندھر) جامِ نو، ترقی، پرچم، الہام، صحیفہ، ادب، انشاء، روح ادب، معارف، پارس، مصور، تہذیب الاخلاق، ادیب (علی

Marfat.com

گڑھ) کہکشاں، کتاب نما، ہماری زبان، ادب جدید، کائنات، تخلیق کراچی، علم و ادب، ادبِ اردو، الرحیم، الولی، وغیرہ۔

''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' ایک اہم کتاب ہے۔ جس میں لفظ ''میرے'' کے گرد مصنف نے ادبی اور تاریخی ہالہ تیار کر رکھا ہے۔ جس سے حال اور مستقبل کا محقق یقیناً مستفید ہوگا اور اس حوالے سے ''میرے'' کو بھی ایک فعال انسان دوست اور ادیب کی حیثیت سے بقائے دوام حاصل رہے گی۔''

(ماہنامہ ''صریر'' کراچی فروری 96ء صفحہ 80)

''میرے بزرگ میرے ہم عصر'' کی جب ہم ان عہد ساز شخصیتوں کے بارے میں پڑھتے ہیں تو ہمیں ڈاکٹر وفا راشدی صاحب کی اپنی شخصیت بڑے وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

اُداس لمحوں کا شاعر
آنس معین

آنس معین کے کلام کو ارباب فکر و نظر نے اپنے اپنے پیمانوں میں تولنے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے۔ بعض حضرات نے شکیب جلالی اور مصطفٰے زیدی میں اس کی مماثلت کے جزیرے تلاش کیے ہیں۔ بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو یہ ایک بچگانہ ہیجانی کیفیت ہے جو کاروان وقت کی گرد میں بہت جلد اپنا چہرہ چھپا لے گی۔

نئی نسل سے شکوہ نہیں، پرانی نسل کے لوگوں میں سے کسے یاد ہوگا کہ احمد ریاض خون تھوک تھوک کر ''موج خون'' کیسے بنا؟ م۔حسن لطیفی نے فرزانگی میں دیوانگی کی منزلیں کس طرح طے کیں؟ ساحر صدیقی مری میں مشاعرہ پڑھنے گیا، صبح کو ہوٹل کے کمرے میں کیوں مردہ پایا گیا؟ حسن بخت کو ''ہر شاخ گل صلیب'' کیوں نظر آئی؟ سبط علی صبا، احمد شمیم اور رام ریاض کی اموات میں کون سے عوامل کارفرما تھے؟ شکیب جلالی کی خودکشی اور مصطفٰے زیدی کی موت کے معمے آج تک لاینحل کیوں ہیں؟ ساغر صدیقی نے چرس میں اور اقبال ساجد نے شراب (؟) میں کیوں پناہیں تلاش کیں؟ اور جان سے گزر گئے!

آنس معین کی شاعری اکتسابی نہیں کہ دوسرے شعرا کے افکار میں اس کی جڑیں تلاش کی جائیں۔ اس کی انفرادیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسروں کے ہاں اس مماثلت او رمشابہت کی جستجو کی جائے۔ اس کی شاعری کے تیور دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس کی شاعری پر اس کی اپنی چھاپ ہے۔

Marfat.com

گئے زمانے کی چاپ جن کو سمجھ رہے ہو
وہ آنے والے اداس لمحوں کی سسکیاں ہیں

☆☆☆

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا!

آنس معین کی کم عمری، اس کی شاعری کی کم سنی اور اس کے کلام کی کمیت اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اگرچہ اس کی زندگی میں اس کے کلام کی اشاعت اور شاعری کا ابلاغ کم کم ہوا، تاہم اس کی خودکشی کے بعد اس کی شاعری کا چرچا ادبی دنیا میں ایک دھماکے کی صورت میں ہوا۔ اخبارات ورسائل کا ادبی منظرنامہ اس کی شاعری کی تفہیم وترسیل میں آج بھی سرگرداں ہے۔

آنس معین کے تخلیقی تجربات اس کی انفرادیت اور غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ اس کی شاعری میں متصوفانہ اور فلسفیانہ نکات کا سراغ تلاش کرنا اس کی تضحیک کے مترادف ہے۔ آنس معین کو رومی، سقراط، ارسطو، کیٹس، شکیب جلالی اور مصطفےٰ زیدی وغیرہ سے مماثلت و مشابہت دینا، اس کے خیالات، افکار اور سوچوں کا موازنہ مذکورہ افراد سے کرنا اس کی توہین ہے۔ ایسی باتوں سے اس کی شاعری کا رتبہ کم کیا جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپنی فکر مضمحل ہے۔ وہ ایک مریضانہ انفعالیت کا شکار ہے۔ اس کی شاعری دوسروں کے خیالات و افکار کی بازگشت ہے۔

ارباب نقد ونظر کو آنس معین کے کلام کو اس کے اپنے شعری تناظر میں پرکھنے اور خیال آرائی کی ضرورت ہے۔ اس کے معاشی، سماجی، تمدنی اور معروضی حالات کے پس منظر کو سامنے رکھ کر سوچ سمجھ کر آرا قائم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ آنس معین ایسا لگتا ہے، مضامین لکھنے والوں سے انصاف کا طالب ہے!

آنس معین کی خودکشی کی وجوہات پر دھند چھائی ہوئی ہے۔ وہ معاشی طور پر آسودہ حال

Marfat.com

تھا۔ ایک بنک آفیسر کی حیثیت سے سماج میں اس کی اہمیت تھی۔ اس کا رہن سہن صاف ستھرا تھا۔ عام زندگی میں وہ لوگوں سے خوش خلقی سے ملتا تھا۔ جو سہولتیں کسی شخص کو زندگی میں چاہییں وہ اسے حاصل تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے؟ کہ وہ اپنی زندگی کا آپ ہی دشمن بن گیا! اس کے ساتھ کون سی ایسی ناانصافی ہوئی تھی کہ وہ جاں سے گذر گیا یا اس سے کسی کی حق تلفی ہوئی تھی یا وہ کسی کا حق دلوانے میں ناکامیاب رہا؟ ذہن میں کئی گرہیں ہیں جو کھل نہیں پا رہیں! شاید کبھی وقت آئے کہ یہ گرہیں کھل جائیں۔

آنس معین کا چونکا دینے والا لہجہ اس کی شاعری کی منفرد پہچان ہے۔

نہ تھی زمین میں وسعت مری نظر جیسی
بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

☆☆☆

کیوں کھل گئے لوگوں پہ مری ذات کے اسرار
اے کاش کہ ہوتی مری گہرائی ذرا اور

☆☆☆

اک ڈوبتی دھڑکن کی صدا لوگ نہ سن لیں
کچھ دیر کو بجنے دو یہ شہنائی ذرا اور

☆☆☆

کس سے بولوں یہ تو اک صحرا ہے جہاں پر
میں ہوں یا پھر گونگا بہرا سناٹا ہے

☆☆☆

اس بند گھر میں کیسے کہوں کیا طلسم ہے؟
کھولے تھے جتنے قفل وہ ہونٹوں پہ پڑ گئے

Marfat.com

ہے کون کہ جو خود کو ہی جلتا ہوا دیکھے
سب ہاتھ ہیں کاغذ کے دیا دیں تو کسے دیں

☆☆☆

میں سوچتا رہا کل رات بیٹھ کر تنہا
کہ اس ہجوم میں میرا شمار کم ہوگا!

☆☆☆

عجب انداز سے یہ گھر گرا ہے
مرا ملبہ مرے اوپر گرا ہے!

☆☆☆

کیا خبر ایک دوسرا آنس
ذات کے احتساب سے نکلے

آنس معین کی لفظیات، اس کے شعری تلازمات، اس کی تراکیب اور خوبصورت بندشیں، اس کے شعر کو زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔ اس کے لہجے کی گمبھیرتا، دھیرے دھیرے سلگنے کا عمل اور اس کا پیرایہ اظہار اس کی شاعری کی شناخت ہے۔

آنس معین کے اشعار پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کا خالق جذبے کی تمازت اور چونکا دینے کے ہنر سے آشنا تھا۔ اگر چہ اس کے انداز شعر گوئی میں بلند آہنگی مفقود ہے تاہم رچاؤ کے ساتھ اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے ایسے اشعار بھی ہیں جنہیں سن کر انسان کی روح تڑپ تڑپ جائے۔

میں دستکیں دے رہا ہوں سب لوگ بند کمروں میں سن رہے ہیں
نکل کے باہر بھلا دسمبر کی سرد راتوں میں کون آئے

☆☆☆

Marfat.com

میں وہ جزیرہ ہوں جو سمندر میں ہر طرف سے گھرا ہوا ہے
میں جتنا بھیگا ہوا ہوں اتنی ہی پیاس محسوس کر رہا ہوں

☆☆☆

ہاتھ میں لے کر پتھر جب میں پاس کھڑا تھا ندی کے
کانپ رہا تھا پانی پر اک چہرہ سہما سہما سا!

☆☆☆

آخر کو روح توڑ ہی دے گی حصار جسم
کب تک اسیر خوشبو رہے گی گلاب میں؟

☆☆☆

یہ قرض تو میرا ہے چکائے گا کوئی اور
دکھ مجھ کو ہے اور اشک بہائے گا کوئی اور

☆☆☆

انجام کو پہنچوں گا میں انجام سے پہلے
خود میری کہانی بھی سنائے گا کوئی اور

☆☆☆

امید سحر بھی تو وراثت میں ہے شامل
شاید کہ دیا اب کے جلائے گا کوئی اور

☆☆☆

کب بار تبسم مرے ہونٹوں سے اٹھے گا
یہ بوجھ بھی لگتا ہے اٹھائے گا کوئی اور

اس کے تبسم کا بوجھ کسی اور نے اٹھایا یا نہیں مگر وہ ادب کی دنیا کو اداس لمحوں کے سپرد کر

Marfat.com

کے حصار جسم کو توڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

آنس معین کی غزل میں الفاظ نے اپنا پرانا ملبوس اتار کر نئے مفاہیم کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔اس کے ہاں ایسے لفظوں کی کمی نہیں جو کہنہ سالی کی دبیز گرد کی تہہ میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ہیں مگر اپنے نئے پن کا بھی احساس دلا رہے ہیں۔ان الفاظ میں اس نے معانی کی نئی روح پھونکی ہے۔سمندر، جزیرہ، سفر، سورج، اندھیرا، سناٹا، آشیاں، بارش، بستی، قامت، دیا، پیڑ، پتے، ہوا، سیلاب، پیاس، پیاسے، عدالت، ہاتھ، دستانے وغیرہ۔ "دستانے کا لفظ تین شاعروں کے ہاں مختلف انداز میں استعمال ہوا ہے

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

(مصطفیٰ زیدی)

سردی لگی تو کل مرے دستانے لے گیا
اب چائے پی رہا ہے وہ دستانے بیچ کر

(ماجد الباقری)

کیا عدالت کو یہ باور میں کرا پاؤں گا
ہاتھ تھا اور کسی کا مرے دستانے میں

(آنس معین)

"دستانے" کا تلازمہ مذکورہ تینوں شاعروں نے اپنے اپنے رنگ میں شعروں کی زینت بنایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آنس دوسروں سے متاثر تھا۔اس کا اپنا منفرد اسلوب تھا لہٰذا دوسروں سے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔وہ ایک طرز سخن کا بانی تھا۔اس الگ طرز سخن کے بانی کا مجموعہ کلام جس قدر جلد ممکن ہو سکے منظر عام پر آ جانا چاہیے!

Marfat.com

چپ رہ کر اظہار کیا ہے، کہہ سکتے تو آنس
ایک علیحدہ طرزِ سخن کا تجھ کو بانی کہتے

☆☆☆☆☆

Marfat.com

عہد ساز شاعر

ماجد الباقری

ماجد الباقری کا ہاتھ اپنے عہد کی نبض پہچانتا ہے۔اس نے شاعری کو جدید زبان کے محاورے کی لذتوں سے آشنا کیا ہے۔وہ نئے خیالات کو اپنی شاعری میں کھاد کے طور پر استعمال کرنے کے ہنر سے آگاہ ہے۔اس کی یہی ہنرمندی اس کی شاعری میں نت نئے Imagesاور خوبصورت پیکر تراشنے میں اس کے لئے سہولت فراہم کرتی ہے۔

ماجد الباقری کی شاعری میں مریضانہ انفعالیت نہیں بلکہ صحت مند معقولیت کا معروضی اظہار ہے۔اس نے سچائی کے فروغ کے لئے اپنی ذات کو مورد الزام ٹھہرانے سے بھی گریز نہیں کیا۔اس کی شاعری میں عہد آفرینی اور آفاقیت کی جھلک نمایاں ہے۔نفسیات کی گرہ کشائیوں، جمالیات کی دل فریبیوں کے ساتھ ساتھ جنسیات کی حقیقت پسندی کے وہ وہ خوبصورت Imagesاس کی شاعری میں بڑی بے تکلفی سے در آئے ہیں۔جو دوسرے شعرا کے ہاں کم کم دکھائی دیتے ہیں۔

ماجد الباقری ادبی پنڈتوں کی سرپرستی کے بغیر خلوص، سچائی اور خیر کی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے شعری سفر پر گامزن ہے۔اس کی غزل کی اساسی صفت جدید طرز احساس کی نمائندگی کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہی ہے۔اس نے نعرہ بازی سے اجتناب کیا ہے اور خود ساختہ جبر کے خلاف علم بغاوت اٹھانے سے دانستہ پہلوتہی کی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ خارجی عوامل اس کی روح فکر میں ارتعاش پیدا نہیں کرتے۔وہ قدم قدم پر یقیناً ایسے عوامل سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن وہ نام نہاد ترقی پسندی کے مروج موضوعات کو چھیڑنے سے گریزاں ہے۔ذات کی گہرائیوں

Marfat.com

میں ڈوب کر شعر کہنا کہ پڑھنے والے کو اپنی ہی داستان کرب معلوم ہو، ماجد الباقری کا خاص انداز ہے۔

کوئی نعیم البدل عطا کر دے
دل تو پروردگار ٹوٹ گیا

☆☆☆

قریب دیکھ کے اس کو، یہ بات کس سے کہوں
خیال دل میں جو آیا گناہ جیسا تھا

☆☆☆

اتنی مدت بعد انکل! آپ آئے ہیں یہاں؟
میں بڑی بیٹی ہوں اس کی، وہ تو کب کی مر گئی!

ماجد الباقری کی فکری کائنات کثیر الجہات ہے۔ اس نے روائتی غزل کے عہد میں جدید تر غزل کی طرف توجہ دی ہے۔ اس کی غزل اس کے عہد کا معاشرتی منظر نامہ لے کر طلوع ہوئی ہے۔ اس کی غزل اپنی مخصوص علامتوں کے سبب اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ ہزاروں اشعار میں اس کا شعر گواہی دے گا کہ یہ ماجد الباقری کا نتیجہ فکر ہے۔ اس انداز کے چند اشعار سے لطف اٹھایئے۔

دیکھا تو کسی جسم پہ ملبوس نہیں تھا
دیوار پہ لٹکی ہوئی تصویر ہٹا کر

☆☆☆

کپڑے تھے شرابور، کڑی دھوپ تھی بن کی
گرمی میں مجھے یاد ہے برسات بدن کی!

☆☆☆

Marfat.com

قوم فلمائی گئی ہے یہ رسالہ دیکھیے
جسم غائب ہر ورق پر چھاتیاں ہی چھاتیاں

☆☆☆

ریل میں بیٹھا دیکھ رہا تھا دریا پر سب ننگی تھیں
اک دن جب دریا پر پہنچا سب نے مجھ کو گھیر لیا

☆☆☆

آنکھ شرمیلی ہے لیکن جسم شرمیلے نہیں
خواہشوں کو ناپنے کے اور کچھ حیلے نہیں

☆☆☆

سامان سر پہ رکھ کے وہ گزری تھی آج بھی
پانی بہت تھا نہر میں ، پر زیرِ ناف تھا!

☆☆☆

اک لمس گرم روح کے اندر اتر گیا
میں سو گیا تو ہاتھ بھی پتھر لگا مجھے

☆☆☆

ایک پٹ کھلنے سے کمرہ بھی نظر آنے لگا
غسل خانے میں لگایا یا کس جگہ ہے آئینہ

☆☆☆

چھینک آئی تھی مجھے دیکھا تو کھڑکی کھل گئی
صرف پردہ ہل رہا تھا ، سامنے کوئی نہ تھا

☆☆☆

Marfat.com

آئینے پر لیٹ کر الٹا مجھے رسوا نہ کر
بند آنکھوں سے بھلا تجھ کو کہاں تک دیکھتا

☆☆☆

قمقمہ جلتے ہی بستر میں سمٹ آیا خیال
اک اندھیرے کا مسافر روشنی میں قید ہے

ماجدالباقری نے عمر گریز پا کے نہ جانے کتنے قیمتی لمحات زندگی کی ضرورتیں مہیا کرنے میں صرف کئے۔ بایں ہمہ تشنہ تکمیل تمناؤں کے شیش محل کی بنیادیں اٹھانے ،فکری حصار کی تعمیر کرنے اور نئی رومانیت کی بستی بسانے میں اس کا ذہن،اول روز سے مصروف و مشغول ہے۔

ہم جس عہد ناپرساں میں سانس لے رہے ہیں۔ وہ ذہنی انتشار، خلفشار اور فرد کی شکست و ریخت کا عہد ہے۔فرد اکائی کی صورت میں خود ہی تماشا ہے اور خود ہی تماشائی: ماجدالباقری کا رول اس زوال آمادہ معاشرے میں ایک تارک الدنیا فرد کا روپ اختیار کر چکا ہے۔وہ اگر چہ تارک الدنیا نہیں لیکن ایک تارک الدنیا فرد ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔اس نے اپنی عزت نفس اور وضع داری کے آبگینوں کو، حالات کی ستم ظریفی کے باوجود،ٹوٹنے نہیں دیا۔ اس نے اپنے عہدے سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا کہ اسے اپنے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ ہونا پڑے۔ وہ اپنے لئے اور اپنے زیر کفالت بچوں کے لئے ذاتی مکان نہیں بنوا سکا۔ کرائے کے مکانوں میں زندگی بسر کی اور آج بھی ریٹائرمنٹ کے بعد ضیق نفس کے عارضے کو سینے سے لگائے، ہانپتا کانپتا زندگی کی گاڑی کھینچتا چلا جا رہا ہے۔

مرض ہے سانس کا، آنکھوں کے سامنے اولاد
میں کھانستا ہوں تو میلہ دکھائی دیتا ہے

دیانت داری، شرافت اور سادگی مزاج کی انتہا ہے کہ محکمہ اطلاعات میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر رہنے کے باوجود وہ اپنا ایک بھی مجموعہ کلام شائع نہیں کروا سکا۔

Marfat.com

ماجد الباقری نے روایات کے پرانے تکنیکی سانچوں کو توڑ کر ابلاغ و ترسیل کے نئے پیرائے اختیار کئے ہیں۔ اردو شاعری میں جدید رجحانات کو فروغ دینے اور نئی فکری لہر پیدا کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ جدید تر شاعری کی بوطیقا کی تخلیق میں ماجد الباقری ہی کی کاوشیں دکھائی دیتی ہیں۔ جدت طرازی، تازگی اور تازہ گوئی اس کی شاعری کی بوطیقا کا ایک روشن باب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علم عروض پر کامل دسترس سے شیوہ بیان شعرا کی صف میں شامل ہے۔ اس کے کلام میں ضعف و انحطاط کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس منزل پر شاعر ایک عمر کے ریاض کے بعد پہنچتا ہے۔

چاند کی آنکھوں پہ بڑھ کر رکھ دیا تھا میں نے ہاتھ
جھیل سے نکلا تو سب منظر سنہرے ہوگئے

☆☆☆

سردی لگی تو کل مرے دستانے لے گیا
اب چائے پی رہا ہے وہ دستانے بیچ کر

ڈاکٹر انور سدید ''اردو زبان'' (دسمبر 1969ء) ''چہرہ بہ چہرہ'' میں لکھتے ہیں:

''بہت کم شعرا نے جدید غزل کو اپنے اسلوب کا تابع فرمان بنایا ہے۔ ماجد الباقری کی خوبی ہے کہ اس نے اس نازک صنف ادب کو اپنی افتادِ طبع کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ماجد الباقری کئی ہزار غزلوں کا معنوی باپ ہے۔ ہر روز آٹھ دس شعروں کی آٹھ دس غزلیں آسانی سے کہہ سکتا ہے''

اور نئے لب ولہجہ کی وجہ سے ماجد الباقری کا شمار پاکستان کے ان چند شعرا میں ہوتا ہے۔ جن میں افتخار جالب، احمد ہمیش، انور شعور، ساقی فاروقی، ظفر اقبال، ریاض مجید، منیر نیازی، مراتب اختر، ناصر کاظمی، ناصر شہزاد، شہزاد احمد، انور مسعود اور وزیر آغا کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''نئے مقالات'' کے ایک باب ''جدید اردو شاعری'' میں اور پروفیسر رشید امجد نے اپنی تصنیف ''نیا ادب'' کے ابواب ''نئی غزل میں پیکر تراشی کی کچھ مثالیں'' اور ''نئی غزل، ایک جائزہ''

Marfat.com

میں ماجد الباقری کا ذکر خوبصورت لفظوں میں کیا ہے۔

پروفیسر سعد اللہ کلیم ''ماجد الباقری کی شاعری'' ''مسافت'' گجرات میں رقم طراز ہے۔

''بیسویں صدی کے آخر نصف میں ہمیں اردو غزل کے اندر مجرد احساس کو اپنے قریب کی اشیاء کے حوالے سے مجسم کرنے کی ایک روایت بڑھتی نظر آتی ہے۔ میں اس روایت کے حسن سے ماجد الباقری اور شکیب جلالی کے کلام میں پہلی بار متعارف ہوا اور میرے محدود مطالعے کے مطابق پاکستان کی اردو غزل پر آج بھی اسی روایت کا سکہ چلتا ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش میں خطرہ یہ ہے کہ بعض وقت انسان خارجی علامتوں کو کسی داخلی احساس میں پروئے بغیر ڈھیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح شعر سے معصومیت اور حسن کے عناصر خارج ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ گہرا خارجی حساس ہوتا ہے جو خارج میں اپنے آپ کو متشکل کرتا ہے اور یہ عمل خود کار ہونا چاہیے، ورنہ اس میں تصنع اور بناوٹ اس کے چہرے کو بے نور کر دے گی۔ اس عمل کی جہت داخل سے خارج کی طرف ہے۔ اسے الٹ چلنے سے روکنے کی ضرورت ہے اور باقری صاحب نے شعوری یا ذہنی طور پر اس کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک دو مثال دیکھئے۔

مردہ پڑے ہیں لفظ کتابوں کی قبر میں
لاشوں کا ایک شہر ہے جو بولتا نہیں

☆☆☆

ہونٹ کی سرخی جھانک اٹھتی ہے شیشے کے پیمانوں سے
مٹی کے برتن میں پانی پی کر پیاس بجھایا کر

اس قسم کے بہت سے اشعار ان کے ہاں موجود ہیں۔''

ماجد الباقری محمد آباد ضلع آگرہ میں ۲۳ جولائی ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم

Marfat.com

اعتماد پور میں حاصل کی اور میٹرک ایسٹ انڈیا ریلوے ہائی سکول ٹونڈلہ سے پاس کیا۔ کچھ دنوں سینٹ جانسن کالج آگرہ میں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد وہیں ۵۰۹ سنٹرل ورکشاپ (ای۔ایم۔ای) میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان آگئے اور ۵۰۱ سنٹرل ورکشاپ (پی۔ای۔ایم۔ای) چکلالہ (راولپنڈی) سے وابستہ ہو گئے۔ بی۔اے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور لندن اسکول آف جرنلزم کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد محکمہ ترقی دیہات میں پبلسٹی کے ضلعی آفیسر مقرر ہوئے۔ 1960ء میں ترقی دیہات کو چھوڑ کر محکمہ تعلقات عامہ پنجاب سے وابستہ ہو گئے اور حال ہی میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

ماجد الباقری کے بن باس کا سفر جمنا تٹ سے شروع ہو کر راوی تٹ پر ختم ہوتا ہے۔ ہجرت کے پس منظر میں ناکام آرزوؤں کی کہانی سچی بھی ہے اور تاریخی بھی۔

جمنا تٹ سے ساتھ آیا تھا، راوی تٹ پر چھوڑ گیا
اس کا بچھڑنا ہم سے یارو! اک قصہ تاریخی ہے!

☆☆☆

پیچھے مڑ کر اب کیا دیکھوں، کون مجھے پہچانے گا؟
صدیوں سے بن باس میں ہوں میں ہر ساتھی اوتار ہوا

رشید نثار اپنے مضمون ''اک تارے والہ جوگی'' میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''اس سفر میں اس نے جس آہنگ، آواز اور لہجے کے ذریعے روح کے تار ہلائے ہیں۔ اس سے ایک بن باسی کا Image ابھرتا ہے۔ جس کا سارا ردِعمل Remoteness کی بنیادوں پر استوار ہے۔ غزلیہ شاعری میں یہ بعد رومانی شاعری کا ہیولہ تیار کرتا ہے۔

میں برسوں سے اک تارے پر من کی جوت جگاتا ہوں
دیوالی کی رات کو تو بھی کوئی دیا جلایا کر

لیکن لمحاتی خیال اور روح کے سفر میں کسی شخص کی طلب شخصی داخلیت اور اختصاصی تجربے کی نشاندہی کرتا ہے۔''

Marfat.com

ماجد الباقری کی شاعری میں جو تہہ داری ہے اور لفظ و معانی کی جو بیکرانی ہے وہ اس کے قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ اس کی سوچوں کی جھیل میں لحہ بہ لحہ، ماجد الباقری کی شاعری، ارتعاش پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے اشعار میں نئے معانی کے پیکر کلبلاتے ہیں اور سانس لیتے لفظ کی تاثیر کا جادو جگاتے ہیں۔

لفظ کی چادر ہٹی اوراق ننگے ہو گئے
کورے کاغذ کے بدن پر رینگتے ہیں دائرے

☆☆☆

ٹھوس لفظوں سے گزر جاتی ہے لفظوں کی شعاع
جب خیالوں میں صدا دیتے ہیں زندہ پیکر

☆☆☆

شہر آہنگ میں الفاظ کی دیواریں ہیں
خامشی جھیل ہے، رستے میں کوئی اندھا ہے

☆☆☆

لفظوں کے ساحلوں پہ ہے لشکر حباب کا
اک بحر بیکراں ہے جزیرہ کتاب کا

☆☆☆

مہندی سی نہ رچ جائے تو یہ میرا ہے ذمہ
دیکھئے تو کوئی لفظ کو ہاتھوں سے مسل کر

ماجد الباقری کے ہاں جو تخلیقی تجربات ہیں وہ نئی دنیاؤں کی دریافت کا سراغ دیتے ہیں۔ اس کے تجربات زمانی حصار توڑ کر جاودانی کیفیت میں ڈھل گئے ہیں۔

Marfat.com

میں رات بن کے سارے گھروں میں اتر گیا
سورج چڑھا تو لوگ مجھے ڈھونڈتے رہے

☆☆☆

سورج تو آج زور کی بارش میں بہہ گیا
نکلا ہے چاند وہ بھی مگر کانپتا ہوا

☆☆☆

پانی کی انگلیاں ہیں کنارے کی ریت میں
کاٹا گیا ہے لمس سمندر کا کھیت سے

☆☆☆

مہتاب پر طلوع جو ہوتی رہی زمین
رکھنا پڑے گا نام زمیں ماہ تاب کا

☆☆☆

سورج کی برچھیوں سے بدن تار تار ہے
پانی میں گھل گیا ہے مگر ڈوبتا نہیں !

☆☆☆

ہاں ! لے چلو، میں ساتھ چلوں گا مگر ہے شرط
تھوڑی سی یہ زمیں بھی اگر آسماں میں ہو

ماجدالباقری کا ایک روپ افسانہ نگار کے طور پر بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے افسانوں کا انتخاب ۱۹۶۷ء میں راولپنڈی سے ''تاک جھانک'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس کی تعریف پاک و ہند کے بیشتر ارباب نظر نے کی اور پاک و ہند کے متعدد ادبی جرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے۔

Marfat.com

''تاک جھانک'' کے بارے میں مظفر حنفی اظہار خیال فرماتے ہیں:

''بزرگ ''تاک جھانک'' کو برا کہتے ہیں لیکن بقول شاد عارفی

عشق کی بزرگوں سے کون رائے لیتا ہے؟

چنانچہ میں نے ماجد الباقری کی ''تاک جھانک'' لطف لے لے کر دیکھی۔ ماجد الباقری کی شعری صلاحیتوں کا تو میں عرصے سے معترف ہوں، یہ معلوم نہ تھا کہ اس میں منجھی ہوئی، شستہ اور بے شکن نثر لکھنے کی صلاحیت بھی ہے اور اس کی ''تاک جھانک'' بتاتی ہے کہ وہ ایک متجسس طبیعت کا مالک ہے اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی پاکیزہ اور گندی، ہموار اور الجھی ہوئی (جیسی کچھ بھی وہ ہے) کا ڈوب کر دیکھنے کا عادی ہے اور اپنے محسوسات و تجربات کے اظہار پر قادر ہے۔ اس کے افسانوں میں وہ چیز جسے کہانی پن کہا جاتا ہے اور جو آج کے نئے افسانہ نگاروں کے ہاں کم کم دکھائی دیتی ہے، اپنی بھرپور دلکشی کے ساتھ ملتی ہے۔ یہ سچ ہے اسے منٹو کی سی دسترس فن پر حاصل نہیں لیکن ''تاک جھانک''، ''سچا پیر'' اور ''زینت خالہ'' جیسے افسانوں کے مصنف سے ہمیں یہ توقع ضرور رکھنی چاہیے کہ وہ منٹو اور رہی وہانوی کے فرق کو پہچانتا ہوگا۔ بحیثیت مجموعی ''تاک جھانک'' ماجد الباقری کے روشن مستقبل کی بشارت ہے۔''

وحید قیصر نے ''تاک جھانک'' پر یوں تبصرہ کیا:

''تاک جھانک'' گہری فکر اور عمیق مشاہدے کی غماز ہے۔ مصنف کا قلم نہایت محتاط انداز میں مختلف کرداروں کے خاکے اور نقشے تیار کرتا ہے۔ مگر وہ اس حد سے سرمو ادھر ہی رک جاتا ہے جہاں پر عریاں نگاری اور شہوانی جذبات کی برانگیختگی کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔''تاک جھانک'' ایک ایسی تصنیف ہے جو ایک عرصے کے بعد سامنے آئی ہے اور اپنی اثر انگیزی کے سبب عرصے تک ذہنوں سے محو نہیں ہوگی۔''

شنید یہ ہے کہ ''تاک جھانک'' کا ایک نسخہ بھی کوئی پبلشر کو دینے کی ہامی نہیں بھرتا کہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا سکے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، پروفیسر ذکی انور، مخمور سعیدی، ڈاکٹر

Marfat.com

کرامت علی کرامت، علی عباس حسینی، رضا نقوی واہی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، سحاب سخن ابراحسنی (گنوری) اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے تبصروں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنسیات اور نفسیات پر اتنی چابکدستی سے کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔

ماجدالباقری کا شعری سفر تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی کے داخلی اور خارجی محرکات کا شعور، تہذیبی اور فکری دیانت، عمرانی وسعت، نفسیاتی گہرائی اور جمالیاتی انداز کی گہرائی کا ادارک کیا جا سکتا ہے۔ حتمی انداز میں یہ کہنا چاہیے کہ ماجدالباقری لمحہ موجود ہی کا نہیں، مستقبل کا بھی شاعر ہے اور اکیسویں صدی اس کے شعر کی تفہیم کے امکانات کو روشن کرنے کیلئے طلوع ہونے کی منتظر ہے۔

حنوط ہوگئی اہرام شعر میں ماجد
ہماری لاش کو حرف و بیاں سنبھالے رہے

☆☆☆

فکر کا تابوت کاندھے پر لئے پھرتا ہوں میں
جس زمیں پر پاؤں رکھتا ہوں تری جاگیر ہے

☆☆☆

اک آنسوؤں کا سمندر تھا جل پری کا لباس
ملا تو ایسے ملا پیکر وفا کوئی !

رشید امجد ''میرا ہم سفر'' کے زیرعنوان ''اوراق'' (اپریل 69ء) میں لکھتے ہیں:

''ماجدالباقری کے یہاں دکھ اور کرب کا اظہار دوسرے بہت سے شاعروں کی طرح محض مطالعاتی نہیں بلکہ معاشرے میں بستے ہوئے انسان کا احساس ہے، وہ اس معاشرے میں Living Dead Man کی حیثیت سے اپنی موجودگی کا تاوان ادا کرتا ہے۔ یوں جہاں اس کے اندر موت کی ڈائن اپنی وحشت ناک صورت کے ساتھ دھیرے دھیرے پاؤں رکھتی ادھر

Marfat.com

سے ادھر جاتی ہے، وہاں وہ زندگی سے چمٹے رہنے اور قربت کا احساس بھی کرتا ہے کہ مرتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر ہی زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماجد کے یہاں یہ دونوں جذبے بیک وقت سفر کرتے ہیں۔ ایک طرف تو اس کی شاعری میں موت، خوف اور فنا کا احساس دبے پاؤں ایک سمت سے دوسری سمت سفر کرتا نظر آتا ہے مگر دوسری جانب خوف کی اس پراسرار وادی میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کا جذبہ بھی پھیلا ہوا ہے۔

آنکھیں کھلی ہیں خوف سے کچھ سوجھتا نہیں
جنگل میں میں ہوں، شیر ہے میرے مچان پر

☆☆☆

دیکھا تو راکھ بھی نہ پرندوں کی مل سکی
بیٹھا تھا آ کے غول سلگتی چٹان پر

☆☆☆

یا سورج کی پیٹھ ادھر ہے یا گھڑیاں دن بھول گئیں
کب سے لیٹے سوچ رہے ہیں بستی میں تاریکی ہے!

ماجد الباقری کی غزلوں میں شکست و ریخت کا عمل بڑے وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ عقائد سے برگشتگی، بدلتی ہوئی سیاسی قدروں اور سماجی روائتوں سے تنفر کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ٹوٹ پھوٹ کا وسیع عمل شروع ہوا ہے۔ ماجد الباقری کے یہاں یہ دونوں سطحیں موجود ہیں۔ پہلی سطح پر شکست و ریخت صرف ذات پر محدود ہے۔ اس میں ذات کے چٹخنے کا عمل احساساتی ہے۔ باہر کے مصنوعی چمکتے تیز رفتار دائرے سے ٹکرا کر ذات چور چور ہوتی ہوئی محسوس ہے، چنانچہ اس سطح پر ماجد کے یہاں کرب کا رنگ گہرا اور لہجے کا درد نمایاں ہے۔

گھنٹی کی آوازیں سچ ہیں، چیخ پہ کوئی کان نہ دو
لوہے کے تابوت پہ ماجد انسانوں کے سائے ہیں

Marfat.com

کئی لوگ جھاڑی میں زخمی پڑے تھے
پہاڑی پہ چڑھنے کا اک راستا تھا

ماجد الباقری کی غزلیات کا مجموعہ ''لفظ کی چادر'' حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

پرکھ پڑچول

پنجابی زبان وادب کے مطالعہ سے ہم میں تفاخر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بالخصوص کلاسیکی شعراء کے ہاں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا ایک بیش بہا خزانہ محفوظ ہے۔ جدید ادب (شاعری) کے مطالعہ سے بھی بہت سے اسرار منکشف ہوتے ہیں، احساس ذات، اقدار کی شکست وریخت اور بنی نوع (انسان) کو درپیش مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم تنقید کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اپنا دامن تہی ہونے کا احساس ہمیں ندامت سے دوچار کرتا ہے۔ یہ بات بڑے دکھ سے کہنا پڑتی ہے کہ چند ایک کتابوں کو چھوڑ کر پنجابی تنقید کی تقریباً تمام کتابیں یا تو تدریسی تنقید کے زمرے میں آتی ہیں یا سطحی تاثرات تک محدود ہیں۔ اس عہد ناپرساں میں جب ہم جناب عارف عبدالمتین کی تنقیدی کاوش ''پرکھ پڑچول'' دیکھتے ہیں تو ایک گونا خوشی کا احساس ہوتا ہے، اور اس پنجابی دشمن عہد میں ان کی کتاب کی اہمیت اور وقعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

عارف عبدالمتین صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں مگر اردو ادب میں اپنے ''امکانات'' کی روشنی میں نقد و نظر کے میدان میں بھی ایک باوقار اور معتبر حوالہ کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید جدید علوم کا احاطہ کرتی ہے جو ان کے وسیع مطالعہ، سائنسی علوم، معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی شعور سے واقفیت اور جان کاری کا نتیجہ ہے!

موضوعات کے اعتبار سے ''پرکھ پڑچول'' کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں پنجابی کی صوفیانہ شاعری کے پس منظر اور پیش منظر سے آگاہی ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں صوفیانہ شاعری کے سدا بہار باغ کے ان پھولوں کی مہک نمایاں ہے، جن میں بابا فریدؒ، شاہ حسینؒ، سلطان باہوؒ، علی حیدرؒ، سید ہاشم شاہؒ، اور خواجہ غلام فریدؒ شامل ہیں۔ تیسرا حصہ ان شعراء کو

Marfat.com

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جنہوں نے کلاسیکی شعراء سے روحانی طور پر کسب فیض کیا اور اپنی شاعری میں روائتی انداز فکر اپنایا۔ ان میں استاد کرم، مولانا بخش کشتہ، پیر فضل گجراتی، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اور حکیم ناصر شامل ہیں۔ موخر الذکر حصے میں نئی شاعری کے نمائندہ شاعروں کے افکار کو منظر عام پر لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، جن میں شریف کنجاہی، قیوم نظر، احمد راہی، باقی صدیقی، ڈاکٹر رشید انور، سلیم کاشر، رؤف شیخ، منیر نیازی، نجم حسین سید، بشیر منذر، اقبال صلاح الدین، حفیظ تائب، اکبر کاظمی، منظور وزیر آبادی، اعزاز احمد آذر، راشد حسن رانا، یونس احقر، اجمل وجیہہ اور شاہین تازلی شامل ہیں۔

اول الذکر حصے کو کتاب کا مقدمہ کہنا درست ہوگا۔ اس حصے میں انہوں نے تصوف، اسلامی تصوف، غیر اسلامی تصوف، مقامی تصوف، غرض کہ تصوف کا مفصل تعارف کرایا ہے، جبکہ دوسرے حصے میں تصوف کی روشنی میں کلاسیکی شعراء کے کلام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جدید شعراء کے بارے میں ان کا تنقیدی رویہ حوصلہ افزا ہے، جس میں توازن اور ہمہ گیری کا احساس نمایاں ہے۔

''توں تے میں'' قیوم نظر کا شعری مجموعہ ہے۔ ''توں تے میں'' کے بارے میں ان کا استدلالی تجزیہ ملاحظہ فرمائیں۔

''اسی توں'' توں مراد قیوم نظر دا اوہ محبوب لیندے آں، جہدے لئی اسیں حقیقت مطلقہ، سچ حق تے احد دے مختلف ناں ورت چکے آں تے ''میں'' توں قیوم نظر دا اوہ عاشقانہ روپ خیال کردے آں جہدے پردے وچ محبوب دی محبت رچی بسی ہوئی اے۔ ''توں تے میں'' اجہے نویکلے رشتے دا اظہار وی کردا اے، جیہڑا جزدا اپنے کل نال ہوندا اے''۔(۱)

اجمل وجیہہ کے بارے میں عارف صاحب رقمطراز ہیں۔

''اجمل وجیہہ نوں اوہدی سادگی تے معصومیت نے انفرادی سطح تے جیہڑے مدھ ماتے چیت ہارے بندے دے نیازے رنگ ڈھنگ بخشے نیں، اونہاں دا اظہار اوہدیاں کئی پنجیاں رومانی

Marfat.com

نظماں وچ ہویا اے۔'' (۲)

آپ نے اندازہ لگایا کہ دوسطری تجزیہ سے شاعر کا مجموعی تاثر ابھر کر سامنے آ گیا ہے، یعنی شاعر کا فکری روپ ہی نہیں، شخصی روپ اور اس کا مزاج بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہی صورت تمام مضامین میں پائی جاتی ہے۔

''پرکھ پڑچول'' تنقید کے علاوہ تحقیقی کاوشوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ نقاد کی ایک خوبی محقق ہونا بھی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شہباز ملک کی وضاحت دیکھئے۔

''پنجابی وچ تنقید لکھن لگیاں نقادنوں پہلاں محقق بننا پیندا اے۔ عارف عبدالمتین ہوراں دی ایس کتاب توں مینوں ایس گل دا بار بار احساس ہوندا رہیا کہ عارف صاحب نے وی پہلے ایک محقق بن کے اپنے لئی شاعر، اوہدے کلام تے اوہدے زمانے دیاں ساریاں نسبتاں نوں ٹھوک وجا کے ویکھیا، پرکھیا اے تے فیر اپنے تنقیدی وچاراں موجب سٹے کڈھے نیں۔'' (۳)

ڈاکٹر شہباز ملک کی اس رائے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ عارف صاحب نے جہاں ''پرکھ پڑچول'' میں ایک نقاد کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہاں ایک محقق کے طور پر بھی عصری سچائیوں کو سامنے لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ تنقید کے حوالے سے پنجابی زبان وادب میں اس کتاب کی کیا اہمیت ہے، اس کے بارے میں جناب نازش کاشمیری ان الفاظ میں اس کا مقام متعین کرتے ہیں:

''پرکھ پڑچول'' پنجابی زبان دی اوہ پہلی باضابطہ مستقل کتاب اے، جہدے وچ چوکھے جامع تے عالمانہ ڈھنگ نال تصوف دے مفہوم تے اوہدی تقابلی تاریخ دا ویروا کردیاں ہویاں، پنجابی صوفیانہ شاعری دے پس منظر تے پیش منظر اتے سلکھنا چانناپایا اے۔

مینوں یقین اے پئی ''پرکھ پڑچول'' پنجابی تنقید وچ عمرانی حقیقت نگاری دے عالی شان رنگ محل دا بنیادی پتھر قرار دتی جاوے گی تے مستقبل دے پنجابی نقاد ایہدے حوالے بناں اگے نہیں ودھ سکن گے!'' (۴)

Marfat.com

جہاں تک عارف صاحب کے اسلوب کا تعلق ہے، انہوں نے استدلالی، تجزیاتی اور منطقی انداز اختیار کیا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ "پرکھ پڑچول" پنجابی تنقید کا پہلا سنگ میل ہے، جس میں تنقید کے میدان میں پنجابی زبان وادب کو ایک وقار اور اعتماد سے روشناس کرایا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ پرکھ پڑچول، صفحہ نمبر ۲۲۴

۲۔ پرکھ پڑچول، صفحہ نمبر ۳۹۲

۳۔ گویڑ پڑچول، صفحہ نمبر ۳۳

۴۔ پرکھ پڑچول، دیباچہ (پنجابی تنقید دا پہلا سنگ میل) از نازش کاشمیری، صفحہ نمبر ۱۰،۱۱

Marfat.com

آب زارِ تمنا کا شاعر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تخلیقات ظلمت پسندی کے نظریات رکھنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج کی صورت میں ادبی افق پر نمودار ہوئی ہیں۔ اس کے تخلیقی یاوصاف کا انعکاس اس کی نظموں، غزلوں، افسانوں اور تنقیدی مضامین کے بین السطور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر کا ادبی منظر نامہ اس کے تخلیقی جوہر اور تخلیقیت شناسی کی چھوٹ کے بغیر نامکمل دکھائی دے گا۔

مناظر عاشقِ ہرگانوی کی تخلیقیت کی جو صورت گری سامنے آ رہی ہے وہ اس کی مقبولیت کا گراف روز بروز بلند کر رہی ہے۔ اس کی شعری کائنات کے مجموعی پس منظر میں اس کی ادبی بلند قامتی عصرِ حاضر کے نقاد کے گرد حیرت اور خوف کے حصار کھینچ رہی ہے۔

وسعت مطالعہ، مشاہدے کی گہرائی اور اعلیٰ ادبی اقدار کی پاسداری سے مناظر عاشق ہرگانوی کے فن میں حساسیت اور ذہانت کا جو خوبصورت اور دل نشین امتزاج در آیا ہے۔ وہ اس کے ہم عصر تخلیق کاروں میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ اس کی نظموں اور غزلوں میں روحِ عصر کی گونج ہے۔ اس کی مختصر نظموں میں جس کمالِ فن کا اظہار ہے وہ آج کے دیگر شعرا کے ہاں اتنا بھرپور انداز میں نہیں۔ اگر اس بات کو یوں کہا جائے کہ یہی کیفیت آفرینی اس کی تخلیقیت کی شناخت ہے تو اس میں مبالغہ ہرگز نہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق کی شاعری میں اپنے عہد کے مسائل کا شعور، علمی اور تہذیبی افکار کی جلوہ گری، جدیدیت کی کرشمہ سازی، عصری مطالعے اور مشاہدے کا ٹھوس بنیادوں پر ایسا انفرادی اظہار ہے جسے نظر انداز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس کی شاعری فکری ژولیدگی کا شکار

Marfat.com

نہیں۔اس کے ہاں پیچیدہ شعری علائم ہیں اور نہ دور از کار استعارے اور کنائے کہ جنہیں پڑھ کر قارئین بھول بھلیوں میں کھو جائیں یا دیواروں سے سر ٹکراتے پھریں۔اس نے جس سادگی اور صاف گوئی کو اپنا شعری اسلوب بنایا ہے۔وہ اس کے باطن کے اجلے پن کا بے ساختہ اظہار ہے!

تخلیق کار کی شناخت کا حقیقی معیار اس کا وہ بنیادی رویہ ہوتا ہے۔جو اسلوب وفکر کی ہم آہنگی سے صورت پذیر ہوتا ہے۔مذکورہ باتوں کی صداقت کی شہادت کے لئے ڈاکٹر مناظر عاشق کی ایک سادہ سی غزل اور ایک مختصر سی نظم ملاحظہ کیجئے۔

نہ اپنے غم سے کبھی روشناس وہ بھی تھا
یہ کیسا قرب تھا جس سے اداس وہ بھی تھا

☆☆☆

ہوا کی زد میں رہے برگِ زرد کی صورت
قبائے گل میں شکستہ لباس وہ بھی تھا

☆☆☆

نصیب غم میں تھی صحرا کی تشنگی ہی لکھی
اک آب زار تمنا کی پیاس وہ بھی تھا!

☆☆☆

فضائے دل میں ہے اب تک گئی رتوں کی مہک
سجائے زلفوں میں پھولوں کی باس وہ بھی تھا

☆☆☆

نہ صرف ہم سے عبارت تھا شوقِ رسوائی
نظر نظر میں لئے التماس وہ بھی تھا!

Marfat.com

زندگی

زندگی رقص سہی

گیت سہی

ساز سہی

میں اسے

آئینۂ خواب وسکوں

کہتا ہوں

میں اسے

صورتِ نیرنگ فسوں

کہتا ہوں

میں اسے

جذبۂ محسوس جنوں

کہتا ہوں!

اگر کوئی تخلیق کار سچائی، خلوص اور انسان دوستی کی مضبوط بنیادوں پر اپنے فن کی عمارت اٹھاتا ہے تو آنے والے دور کے حقیقت شناس قارئین کو اپنے عہد کے حالات و واقعات کے صحیح محرکات تلاش کرنے میں دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی کا جس کرب کے عالم میں مشاہدہ کیا ہے کچھ اسی کا دل جانتا ہے۔ اس عمل کے دوران میں اس کے دل پر جتنے گھاؤ لگے ہیں انہیں کلی نہیں تو جزوی طور پر ضرور اس کی تخلیقات میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں تجزیاتی نقطۂ نگاہ کا واضح اظہار ہے۔ اس نے اپنے قارئین کو بارود

Marfat.com

کے دھوئیں اور بو باس کے زیرِ سایہ زندگی کے ویران سناٹوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اس نے اپنے شہر بھاگل پور کے فسادات کی تیز و تند آندھیوں میں بھی اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر موصوف نے ان فسادات کو بھوگنے کے بعد ''آنکھوں دیکھی'' کے عنوان سے تاثر سے بھرپور نظموں کی جو کتاب پیش کی، اس میں سے دو مختصر نظمیں دیکھئے۔

ہم کتنی بار مصلوب ہو چکے ہیں
فصیلوں سے گرائے جا چکے ہیں
تم کتنی بار زہر کے پیالے دے چکے ہو
پھر بھی
ہم اپنی ہتھیلیوں پر گردن اٹھائے پھر رہے ہیں
ہم اتنے ڈھیٹ ہو چکے ہیں
کہ ختم نہیں ہوتے!
ختم نہیں ہوں گے۔۔ ختم نہیں ہوں گے

<u>لاکھ کوشش کے باوجود!</u>

ہریالی یہاں دھوئیں اور راکھ کی شکل میں
اڑ رہی ہے!
لوگ ایک دوسرے کو
کوشش کے باوجود نہیں پہچان پاتے
کبھی کبھی تو جھنجھلا کر
اپنے ہی منہ پر تھپڑ مار لیتے ہیں!
مکھیوں کی طرح بھنبھناتے
اور۔۔۔ پاگلوں کی طرح چلاتے ہیں

Marfat.com

کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے کہیں

فساد کے بعد!

اور ایک نظم کے آخری چار مصرعے

راستے کے پیچ وخم سے
دل مرا گھبرا رہا ہے
خون کی ندی بہی ہے
چشم تر کے سامنے!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی غزل کی گداختگی، بے ساختگی اور جدت طرازی، اس کی انفرادیت کے استحکام کی ضامن ہے اور غزلیات میں سے چند اشعار دیکھئے۔

جوان بیٹیوں کا غم، اسے کو بھولتا ہی نہیں!
وہ آدھی رات کو سوتے میں جاگ اٹھتا ہے

☆☆☆

میں روشنی کے ٹھکانے تو جانتا ہی نہیں
مگر نہ جانے اندھیرا کہاں سے اگتا ہے

☆☆☆

اب کے ساون پنچھی گانا بھول گئے
سب کے سب وہ پریم ترانہ بھول گئے

☆☆☆

بچے ہی سے اس کی ماں تک پہنچے تھے
بچے ہی کو گود اٹھانا بھول گئے!

☆☆☆

Marfat.com

ہجوم حسرت و ارماں کا شور برپا تھا
کسے خبر تھی بھرے شہر میں وہ تنہا تھا
جہاں جہاں سے بھی گذری تھی آگہی کی کرن
وہاں وہاں سے فریب نظر بھی گزرا تھا

☆☆☆

پھر ہواؤں کا ساز توڑیے
طائروں کی آواز توڑیے

☆☆☆

اپنے اندر زندہ کوئی نہیں
زندگی کا انداز توڑیئے

ڈاکٹر مناظر عاشق کی مختصر ترین نظمیں بھی بڑے گمبھیر تاثر کی حامل ہیں۔اس کی چند نظمیں پڑھیئے جن میں فکر کی قوس قزح اپنی بہار دکھارہی ہے۔

اپنا شہر ـــــــ ریختہ ـــــــ تجزیہ

سب کچھ ڈھل رہا ہے
اس دھوپ کے علاوہ
آسمان کے علاوہ

سفر اور سفر کے بعد
ڈوبتے مستول کی یاد
محض
ایک رومانی پن!

اس کی نظم ''نیا عہد نامہ'' اس کے عہد کے سفاکانہ رویے کا برملا اظہار ہے۔

Marfat.com

روئی کی طرح ریشہ ریشہ جلا دیا

شیشے کے سامنے آنکھیں بھر لیں سیمنٹ سے

چھٹکارا نہیں ملا

بدلہ کچھ بھی نہیں

گندگی اسی طرح پھیلتی بڑھتی رہی

اسی طرح کچلا جاتا رہا آدمی

کاغذ سے یا پھر ٹینک سے!

ڈاکٹر مناظر عاشق تخلیقی اور عروضی تجربات سے اپنے فکری رویوں کو ارتقائی عمل سے ہم آہنگ کر رہا ہے۔ اس کا عروضی اجتہاد اس کے لئے سرمایہ افتخار ہے کہ اس نے مروج پیمانوں کے ساتھ ساتھ غزل کے لئے نئے اوزان تشکیل دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی نئی غزلیں مفالن، فعلن، مفاعلن، فعلن، نئی بحریں اور نئے اوزان ملاحظہ ہوں۔

غموں کا ذکر، الم کی داستاں نہ کہو
اندھیری رات کے لمس کا بیاں نہ کہو

☆☆☆

بکھر جائے گا ہوا کا اک جھونکا
دھواں سحر کا ہے اسے خزاں نہ کہو

☆☆☆

ہر ایک آنچ مری ہے زندگی لیکن
گھٹن کو میرے فن کی داستاں نہ کہو

☆☆☆

زباں کو بخش رہے ہو ذائقہ لیکن

Marfat.com

لہو لہو ہے لہو کی تلخیاں نہ کہو!

☆☆☆

پرندہ کوئی اب وہاں نہیں عاشق
سجے ہوئے تنکوں کو آشیاں نہ کہو

ڈاکٹر مناظر عاشق نے اس غزل میں ایک نیا وزن ترتیب دیا ہے۔
مفاعلن فعول مفاعلن فعول

عجیب فصل ہے یہ غم نہاں نہ ناپ
یہاں کسی بھی رخ کی اداسیاں نہ ناپ

☆☆☆

چھپی ہوئی مٹھاس [illegible] لبوں میں دیکھ
کسی [illegible] ذہن کی تلخیاں نہ ناپ

☆☆☆

بکھر گیا ہے شاخ پہ تنکے کا لباس!
مرے وجود سے مرا آشیاں نہ ناپ

☆☆☆

یہ سلسلہ وفا کا یہ رشتہ حیات
رفاقتوں کے شہر کی کھائیاں نہ ناپ

☆☆☆

جو قید فکر میں ہے تری وہی ہے اصل
جو اڑ گیا فضاؤں میں وہ دھواں نہ ناپ

☆☆☆

Marfat.com

الجھ رہی ہے کب سے یہ راستے کی طرح
بہت طویل سی ہے یہ داستاں نہ ناپ

ایک اور نیا وزن دیکھئے۔

فاعلان فاعلن مفعول

کرب کا سماں ہے میرے نام
جیسے اک جہاں ہے میرے نام

☆☆☆

تنکے تنکے آندھیوں کا ذکر
کوئی آشیاں ہے میرے نام

☆☆☆

چیختی مشینیں تیرے پاس
شہر کا دھواں ہے میرے نام!

☆☆☆

ہر ورق پہ زخم کی تحریر
ساری داستاں ہے میرے نام

☆☆☆

روشنی کا نفظ تیرے پاس
درد کا بیاں ہے میرے نام

فکر، فن اور تجربے سے بھرپور روح کو گداز عطا کرنے والی مناظر عاشق ہرگانوی کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری اردو کے شعری سرمائے میں اضافہ ہے۔

Marfat.com

سجاد مرزا کے فن پر مشاہیر کی آرا

سجاد مرزا نے اپنی قبلہ گاہ عقیدت میں کعبے کی اذان یا زمزمہ نعت عجب والہانہ انداز اور عارفانہ آہنگ میں بلند کیا ہے اور اس والہانہ نعت سرائی اور عارفانہ زمزمہ پیرائی نے سجاد مرزا کے کلام کی سطح کو بے حد بلند کر دیا ہے۔

رئیس امروہوی

سجاد مرزا ایک جانے پہچانے شاعر ہیں اور ان کے مزاج کی سادگی اور طبیعت کی عاجزی کو ان کی نعت گوئی میں اساسی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ وہ بڑے سیدھے سادے انداز میں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضانِ رحمت کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نعت نے ادب و عقیدت کی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات سے انہوں نے اپنے فکر و فن کو منور کیا ہے۔

حفیظ تائب

سجاد مرزا نے ایک طرف تو دلکش زبان و بیان میں مدح وثناء کے چمن آراستہ کئے ہیں اور دوسری طرف معلم بشریت، ہادیٔ انسانیت، مصلح اعظم اور رہبر کامل کی سیرت نگاری کے وسیلے سے ہماری تشکیل کردار کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

عاصی کرنالی

سجاد مرزا کی نعت گوئی ان کے جذب کامل اور طلب صادق کا آئینہ ہے۔ اس آئینے کو ابھی اور صیقل ہونا ہے۔ یہ کام ان کے صدق ایمان اور مسلسل مطالعہ سے مکمل ہوگا۔ جذبے کی صداقت ان کے کلام سے عیاں ہے۔

سید محمد حسین کلیم

سجاد مرزا کے نعتیہ کلام میں جابجا عقیدت اور عجز سے معانی کے تابناک تازہ ایقین ہوتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسم مقدس جب بھی ان کے قلم سے پیشانی قرطاس پر منتقل ہوتا ہے تو ادب واحترام سے ان کے فہم وادراک جھک جھک جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی تو اسم مقدس ہے جس کی تاثیر سے مصائب اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں اور رحمت مصطفوی سایہ کناں ہونے لگتی ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا

سجاد مرزا جدید غزل گو ہیں۔ انہیں اپنے عہد کی حسیت کا ادراک ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری عقیدت و محبت رسول کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نعتوں میں اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے اور کرانے کا پیغام ملتا ہے کہ اس کے بغیر قومی اور ملی ترقی ناممکن ہے۔

سید ماجد الباقری

سجاد مرزا کا نعتیہ مجموعہ "چراغ آرزو" شاہ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حضور کی عقیدت و محبت، اظہار نسبت اور کمال آرزو کا وہ چراغ ہے جس کی تابناک کرنوں میں فنی اسالیب اور انداز بیان کے ساتھ ساتھ مقام مصطفوی کی رعنائیاں جلوہ فگن ہیں۔

صاحبزادہ شبیر کمال بیابانی

"پرتو اقبال" سے جہاں سجاد مرزا کی حضرت علامہ اقبال سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے وہاں موصوف کی شاعرانہ اپج کا پہلو بھی واضح طور سے سامنے آتا ہے۔ علامہ اقبال کی منظومات کی تضمینیں بہ چند آسان کام نہیں

Marfat.com

کہ اس راہ میں کئی ایک سخت مقامات آتے ہیں حضرت علامہ کے ہاں ''جوشِ بیان'' ان کی شاعرانہ خصوصیات کا نمائندہ وصف ہے۔ اس معیار پر کوئی پورا اترا ہے اور نہ اترے گا۔ تاہم تقلید ایسی سعی باعث صد تحسین ہے اور ہمارے دوست جناب سجاد مرزا نے علامہ اقبال کے کلام پر کی گئی تضمینیں جمع کر کے واقعی عرق ریزی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ''پرتو اقبال'' میں جو نظمیں اور غزلیں علامہ کے رنگ میں کہی گئی شامل کی گئی ہیں وہ بھی اپنی جگہ بہت خوب ہیں اور اگر آج کے ماحول اور معاشرہ کو پیش نظر رکھیں تو سجاد مرزا قابل صد آفرین گردانے جائیں گے کہ آپ نے یہ کار خیر بطریق احسن انجام دیا ہے۔ شعری محاسن اور لحن و آہنگ کا شعور جناب سجاد مرزا کو قدرت نے خوب فراخدلی سے مرحمت فرمایا ہے۔ اقبال کے رنگ میں یہ تخلیقات میرے اس دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پھر آپ کا دنیائے رنگ و بو سے جو مشاہداتی ربط ہے وہ بھی آپ کے بہت کام آیا ہے۔ اور ان خوبصورت نظموں کی تالیف وترتیب میں تجربہ کار جاؤ اپنی نشاندہی خود کرتا معلوم ہوتا ہے۔

محمد عبداللہ جمال

''درد کی خوشبو''۔۔۔ سجاد مرزا کی نظموں کا تازہ مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں ایک ایسا شاعر ابھرا ہے جس نے مغربی تمدن کی چکا چوند کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک دیئے، بلکہ مصنوعی روشنی کے سیلاب میں بھی اپنے وطن کی نمناک خوشبو اور بھیگی ہوئی چراغ کی لو ایسی یادوں کو محفوظ رکھا ہے۔ درد کی ایک رو سی ان نظموں میں سرائیت کرتی چلی گئی ہے۔ بیشک اس کی نظموں میں ترقی پسند نظم کی لفظیات کے ریزے جا بجا مل جاتے ہیں اور موضوعات کے سلسلے میں بھی اس نے بعض مقبول رویوں کو اپنایا ہے مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ سجاد مرزا کی شاعری نے اپنے زور نمو میں بھاری لبادے کے ٹانکوں میں سے خود کو نہ صرف آشکار کیا ہے بلکہ یہ یقین بھی دلایا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ مزید آزادی کا مظاہرہ کرے گی اور پھر کھلی فضا میں اڑنے بھی لگے گی۔۔۔ مجھے سجاد مرزا کے ہاں بڑے امکانات دکھائی دیئے ہیں اور میری یہ دعا ہے کہ وہ اس میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا

سجاد مرزا اپنے دل میں چراغ عشق مصطفوی ﷺ جلائے، دیار حبیب کی جانب آنکھیں بچھائے اور ذکر شہر نبی سے اپنے لبوں کو سجائے نعت گوئی کے لئے زمزمہ پیرا ہیں۔ ان کی نعت نے انہیں جہاں حُب رسول ﷺ میں بے بہا دولت ودیعت کی ہے وہیں چاہت کا وہ اعتبار بخشا ہے جس میں سرشار ہونے کا ہر دل زندہ آرزو مند ہے ان کے نعتیہ کلام میں سادگی، پاکیزگی، حسن عقیدت، والہانہ پن اور جذب وطلب کے گلہائے تازہ جا بجا مہکار رہے ہیں۔

محمد اقبال نجمی

سجاد مرزا کو غالب سے دلچسپی ہے۔ اور وہ زیادہ تر غالب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ غالب نکتہ میں ان کے غالب کے بارے میں بارہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ انکا ماہرین غالب میں شمار نہیں ہوتا مگر وہ غالب سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے غالب کو خوب پڑھا ہے اور یہ مقالات حاصل مطالعہ ہیں۔ ان مقالات سے قاری کو غالب کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تفہیم غالب کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ثابت ہو جاتا ہے کہ سخن فہم بھی غالب کے طرفداروں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com